بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

تاریخِ اسلام

برائے جماعت نہم - دہم

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور محفوظ ہیں۔
منظور کردہ: وفاقی وزارتِ تعلیم (شعبہ نصاب سازی) حکومت پاکستان، اسلام آباد۔
اس کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے ٹیسٹ پیپرز، گائیڈ بکس، خلاصہ جات، نوٹس یا امدادی کتب کی تیاری میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

فہرست

باب نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
1	عرب قبل از اِسلام	1
2	حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی مکی و مدنی زندگی	6
3	سیرت نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم (مختلف پہلو)	34
4	خلافتِ راشدہ	40
5	خلفائے راشدین کی خصوصیات	72
6	عہدِ بنواُمیّہ	76
7	بنواُمیّہ کے کارہائے نمایاں	91
8	خلافتِ بنوعباس	97
9	بنوعباس کے کارہائے نمایاں	117

مصنّف: ◉ ڈاکٹر شاہد مختار نگران: ◉ غیاث عامر

ڈائریکٹر (مینوسکرپٹس): ◉ ڈاکٹر مبین اختر ڈپٹی ڈائریکٹر (گرافکس)/آرٹسٹ: ◉ عائشہ وحید

ناشر: مطبع:

تاریخِ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت

باب
1

عرب قبل از اِسلام

معاشرتی حالات

عرب معاشرہ مختلف قبائل پر مشتمل تھا۔ ہر قبیلہ کے لوگ اپنے اپنے قبیلے کے ساتھ وفادار ہوتے تھے اور قبیلہ کے سردار کے حکم پر جان تک دے دیتے تھے۔ البتہ قبیلہ کا سردار ان کی رائے سے منتخب ہوتا تھا۔ قبیلہ کے سرداروں کے غرور اور ایک دوسرے کے ساتھ بلاوجہ کی دشمنیوں کے سبب ایک قبیلہ والے دوسرے قبیلے کے خلاف جنگ پر تیار ہوجاتے تھے۔

قبائل کے درمیان معمولی معمولی باتوں پر جنگ چھڑ جاتی تھی۔ بنوتغلب اور بنوبکر کے درمیان قتل پر چالیس برس تک جنگ ہوتی رہی۔ الغرض قبائلی سرداروں کی انا اور تکبّر کی بنا پر تصادم ہزاروں آدمیوں کے قتل کا باعث بن جاتا تھا۔

عرب کے باشندوں میں سے زیادہ مالدار لوگ شہروں میں رہتے تھے، ان کو ''حضری'' کہا جاتا تھا۔ ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ طائف اور یثرب (مدینہ) جیسے شہروں میں جہاں پانی مل جاتا تھا، وہاں زراعت اہم پیشہ تھا لیکن مکہ کے لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ ہی تھے۔ عرب میں زیادہ تر تجارتی قافلے لوٹ لیے جاتے تھے لیکن قریشِ مکہ کا احترام کیا جاتا تھا، اس لیے ان کے قافلے محفوظ تھے۔ چنانچہ ان کی تجارت ترقی پر تھی نیز حج کے موقع پر ان کے لیے روزگار کے بے شمار مواقع تھے۔ شہری لوگ جانور بھی پالتے تھے اور ان کے اندر وہ تمام صفات موجود تھیں جو شہری آبادی میں ہوا کرتی ہیں۔

عرب کی آبادی کی اکثریت صحرا میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتی تھی یہ لوگ ''بدو'' کہلاتے تھے۔ جانور پالنا ان کا اہم ترین پیشہ تھا۔ وہ چراگاہوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے رہتے جہاں پانی اور چارہ میسر ہوتا وہاں قافلہ مقیم ہوجاتا۔ جانوروں کا دودھ اور گوشت ان کی بڑی بنیادی ضرورت تھی۔

عرب معاشرے کا ایک مظلوم طبقہ غلام تھے جو آپس میں جنگ کی صورت میں شکست کھانے والے قبیلہ کے مرد غلام اور عورتیں لونڈیاں قرار پاتی تھیں۔ غلاموں کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔

معاشرتی برائیاں

عرب میں شراب نوشی کا رواج تھا۔ امرا کے گھر شراب خوری کے اڈے تھے۔ ان کے ہاں جوا کھیلنا ''شرفا'' کا دستور تھا۔ عرب معاشرے میں عورت انتہائی مظلوم تھی۔ مرد جب چاہے اُسے طلاق دے سکتا تھا۔ عورت کی اس حالتِ زار کے سبب بچی کا باپ ہونا باعثِ شرم سمجھا جاتا تھا جس وجہ سے لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔

عرب معاشرے نے شعر وسخن میں بہت ترقی کی لیکن ان کی شاعری پر فحاشی اور بے حیائی کا غلبہ تھا۔ قبیلے کے لوگ عام طور پر اپنے آدمی کے قتل کا انتقام لیتے اور اس کے لیے جنگ کی راہ اختیار کی جاتی جو مزید انسانی جانوں کو ختم کرنے کا باعث بنتی۔ شہری لوگ دیت یا خون بہا لے کر قتل معاف بھی کر دیتے تھے لیکن اس کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ انتقامی لڑائی غیرت کا تقاضہ سمجھی جاتی تھی۔ مجرموں، جنگی قیدیوں اور دشمن کے آدمیوں کو ایذائیں دے کر مارا جاتا تھا۔

اخلاقی خوبیاں

عرب معاشرے کی ان برائیوں کے ساتھ ساتھ ان میں بعض خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے عرب قوم دینِ حق کی علمبردار بنی۔ عرب نہایت غیور قوم تھے اور بے غیرتی و بے عزتی برداشت نہیں کرتے تھے۔ عربوں نے کبھی غلامی برداشت نہیں کی اسی وجہ سے عرب کے دونوں طرف بڑی حکومتوں کی موجودگی میں بھی عربوں کی آزادی محفوظ رہی۔ بالعموم عرب ارادے کے پکے تھے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر چیز کی بازی لگا دیتے تھے۔

عربوں کی اکثریت ڈنکے کی چوٹ پر حق بات کہنے اور نہایت بے خوفی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرنے کی عادی تھی۔ ریگستان کی سخت آب و ہوا نے انھیں تکلیفیں برداشت کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ عرب اپنے آپ کو فصیح اللسان اور باقی لوگوں کو عجمی (گونگے) کہتے تھے۔

عربوں کو اپنے آباؤ اجداد کے نام یاد ہوتے تھے ان کے اندر حافظے کی عمدگی کی وجہ سے شجرۂ نصب کو ذہن میں محفوظ رکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ ان کی ایک خوبی جو مضبوط معاشرے کی تنظیم و تعمیر کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی تھی اپنے اقربا سے محبت تھی۔ قبائلی نظام میں تحفظ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب خاندانی نظام مضبوط ہو۔

سیاسی حالات

عرب میں کوئی مرکزی حکومت قائم نہ تھی بلکہ ہر قبیلہ کی اپنی تنظیم تھی۔ قبیلہ کا سردار سابق سردار کی وفات کے بعد باہمی مشاورت سے چنا جاتا تھا۔ اس کے لیے سابق سردار کے ساتھ رشتہ داری کے ساتھ ساتھ اس کی ذاتی صلاحیتوں، شجاعت و دانش مندی کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا تھا۔

عرب میں دو قسم کے قبائل آباد تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے جو قبیلے تعلق رکھتے تھے وہ ''عدنان'' کہلاتے تھے۔ بنو ربیعہ، بنو مضر اور بنو قضاعہ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا، جبکہ دوسرے ''قحطانی'' کہلاتے تھے۔ قحطانی قبائل کا اصل مرکز یمن تھا جو ایک زرخیز علاقہ ہے، چنانچہ ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ انھوں نے شام، حیرہ اور یثرب میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔

اوس و خزرج اور بنو خزاعہ وغیرہ قحطانی تھے۔ عدنانی یا شمالی قبائل اور قحطانی یا یمنی قبائل کے درمیان زمانہ قدیم سے رقابت تھی اور خانہ کعبہ کا تقدس جو عدنانی قبائل کو ایک طرح سے فضیلت دیتا تھا، یمنیوں کو قطعی ناپسند تھا۔ اسی لیے ابرہہ نے یمن میں اپنا قبلہ بنا کر خانہ کعبہ کو

منہدم کرنے کی کوشش کی اور خود تباہ ہوا۔

قبائلی نظام اور عربوں کے مخصوص مزاج کا انھیں ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ کبھی کسی ملک کے غلام نہ بنے البتہ یمن کا علاقہ جو سرسبز و شاداب تھا اور سمندر کے قریب ہونے کی وجہ سے وہاں تک رسائی بھی آسان تھی، کبھی حبشہ کے عیسائیوں کے قبضے میں آجاتا اور کبھی ایران کی مجوسی حکومت اس پر قبضہ کر لیتی تھی۔

مذہبی حالات

عربوں کی اکثریت کا مذہب بت پرستی تھا۔ بتوں کی پوجا کرنے والے دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اولاد ہونے کے سبب دینِ ابراہیمی پر ہیں حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام بت شکن تھے اور یہ بت پرست۔ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے یعنی ہر دن کا بت علیحدہ تھا۔

یہودی حضرت یعقوب علیہ السّلام کی اولاد تھے۔ ان کے تین قبائل یثرب میں آباد تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے ساتھ تعلق کے باعث ان کو عرب میں علمی فوقیت حاصل تھی۔ ان کے مقابلے میں عرب ''اُمی'' یعنی اَن پڑھ سمجھے جاتے تھے۔ سود خوری ان کا محبوب پیشہ تھا۔ اُمیوں کا مال ہڑپ کر لینا ان کے نزدیک جائز تھا۔

عرب میں عیسائی مذہب کے ماننے والے بھی موجود تھے اور اس مذہب کے بارے میں اچھی رائے پائی جاتی تھی۔ بہت سے حق کے متلاشی مختلف مذاہب سے راہِ فرار حاصل کر کے عیسائیت قبول کر چکے تھے تاہم بہت سے جرائم پیشہ لوگ سزا سے بچنے کے لیے راہب ہو جاتے تھے چنانچہ کلیساؤں میں ہر طرح کی اخلاقی برائیاں پائی جاتی تھیں۔

ایران و عراق کا غالب مذہب آتش پرستی تھا۔ آتش پرست نیکی و بدی کے دو خداؤں کے قائل تھے جبکہ عملاً وہ آگ کی پوجا کرتے تھے۔ ایران کے ساتھ ملحقہ علاقوں میں بھی یہ مذہب رواج پا چکا تھا۔ چند عرب ایسے بھی تھے جو تمام مذاہب کے پیروکاروں کی بری خصلتیں دیکھ کر دہریے بن گئے تھے۔ وہ کسی بھی خدا کو نہیں مانتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ان تمام خداؤں سے بیزار تھے جن کی پوجا کی جارہی تھی لیکن اصل اِلٰہ تک ان کی رسائی نہیں ہوتی تھی، انھیں ''صابی'' یعنی بے دین کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

عرب میں خال خال ایسے لوگ بھی تھے جو غور و فکر کے نتیجہ کے طور پر اس حقیقت پہ پہنچ چکے تھے کہ اللہ ایک ہی ہے جو اس کائنات کا خالق ہے لیکن اس اللہ تک کیسے پہنچا جائے؟ اس کو کیسے یاد کیا جائے؟ اِن سوالوں کے جواب اُن کے پاس اس وقت تک ممکن نہ تھے جب تک کہ خود اللہ ان کی راہنمائی نہ کرے چنانچہ رب کریم نے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو مبعوث فرما کر دینِ حق کو واضح فرمایا اور قرآن کریم کے ذریعے حق و باطل کو ایک دوسرے سے مُمیّز کر دیا۔

مکہ کی ریاست

طلوعِ اسلام سے پہلے سرزمینِ عرب میں قبائلی نظام رائج تھا۔ بڑے شہروں میں کئی قبائل اکٹھے رہتے تھے۔ ان کے درمیان بنیادی امور پر مفاہمت نہ ہونے کے سبب باہمی جنگ وجدل چلتا رہتا تھا۔ چنانچہ یثرب میں بنو اوس اور بنو خزرج کے درمیان جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور یہود کے تین قبائل میں سے کوئی بنو اوس کا ساتھ دیتا اور کوئی بنو خزرج کا۔ مکہ کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ مکہ میں آباد قبائل نے بنیادی امور پر اتفاق کر کے حکومت کے مختلف شعبے آپس میں بانٹ رکھے تھے۔

مکہ نہایت قدیم شہر ہے۔ اس کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے رب کریم کے ارشاد پر رکھی تھی۔ اس شہر کی ترقی پانی کے اس چشمے کی وجہ سے ہوئی جو حضرت اسماعیل علیہ السّلام کے پاؤں کے پاس اس وقت رواں ہو گیا جب آپ علیہ السّلام پیاس سے بے تاب تھے اور آپ علیہ السّلام کی والدہ پانی کی تلاش میں صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان چکر لگا رہی تھیں جب انھوں نے اس چشمے کو دیکھا تو انھوں نے اسے زم زم (رک جا، رک جا) کہا اسی چشمۂ زم زم کا پانی اس لق دق صحرا میں آبادی کا سبب بنا۔ چند سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السّلام دوبارہ یہاں تشریف لائے اور انھوں نے حضرت اسماعیل علیہ السّلام اور حضرت جبریل علیہ السّلام کی مدد سے خانہ کعبہ تعمیر کیا جو دنیا کی سب سے قدیم سجدہ گاہ ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السّلام کی نسل سے قصی بن کلاب وہ شخص ہے جس نے بنو اسماعیل کا اقتدار بحال کیا اور قریش کے مختلف قبائل کو متحد کیا۔ قصیٰ بن کلاب نے فہر کی تمام شاخوں کو اکٹھا کر کے ان کے درمیان مناصب تقسیم کیے اور اس طرح مکہ کی ریاست وجود میں آئی۔

قصیٰ بن کلاب اس ریاست کا سربراہ تھا۔ وہ دارالندوہ کی صدارت کرتا جہاں بڑے بڑے معاملات طے ہوتے۔ لڑکے لڑکیوں کے رشتے ناطے کیے جاتے۔ جنگ کا پرچم کھولا جاتا۔ خانہ کعبہ کی پاسبانی اور چابیاں اس کے پاس تھیں نیز حاجیوں کے لیے پانی بھرنے (سقایہ) اور حاجیوں کی میزبانی (رفادہ) کا اہتمام بھی وہ کرتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا دوسرا بیٹا عبد مناف ریاست کا سربراہ بنا لیکن بعض شعبے بڑے بیٹے عبدالدار اور اس کی اولاد کی تحویل میں دے دیے گئے۔

مکہ کی ریاست جمہوری حکومت نہ سہی لیکن اس کی روایات میں عام افراد کی شرکت اور مشاورت سے فیصلے حقوق و فرائض کا تعین اور اس طرح کے دوسرے ضوابط موجود تھے۔

مشقی سوالات

-1 درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں۔

-i عرب میں آباد دو قسم کے قبائل کون کون سے تھے؟ نام لکھیں۔

-ii اہل عرب میں صابی یا بے دین کسے کہا جاتا تھا؟

-iii مکہ کا شہر کس نے اور کیسے آباد کیا؟

-iv قصیٰ بن کلاب نے مکہ کی ریاست کو کیسے منظم کیا تھا؟

-v عربوں کی اخلاقی خوبیاں تحریر کریں۔

-vi قصیٰ بن کلاب کی ریاست میں دارالندوہ کا کردار مختصر لکھیں۔

-2 ہر سوال کے نیچے چار جوابات دیے گئے ہیں۔ درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

-i مکہ کا شہر عرب کے کس حصہ میں واقع ہے؟

الف۔ یمن ب۔ نجد

ج۔ حضر موت د۔ حجاز

-ii مکہ کے لوگ اپنے اہم ترین مجموعی فیصلے کہاں کرتے تھے؟

الف۔ خانہ کعبہ کے پاس حرم میں ب۔ کوہ صفا و مروہ کے پاس

ج۔ ابوجہل کے گھر د۔ دارالندوہ میں

-iii مکہ کی بنیاد کس نے رکھی؟

الف۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام ب۔ حضرت اسماعیل علیہ السّلام

ج۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام د۔ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

-iv یہودی کس کی اولاد تھے؟

الف۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام ب۔ حضرت یعقوب علیہ السّلام

ج۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام د۔ حضرت نوح علیہ السّلام

-v بنوتغلب اور بنوبکر کے درمیان قتل پر کتنے برس تک جنگ ہوتی رہی؟

الف۔ 30 برس ب۔ 35 برس

ج۔ 38 برس د۔ 40 برس

باب 2

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی مکی و مدنی زندگی

حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کا تعلق خانوادۂ ہاشم سے تھا جن کو مکہ کی ریاست کا سربراہ مانا جاتا تھا۔ ہاشم کی شادی بنونجار کی ایک خاتون سلمٰی سے ہوئی تھی جس سے ان کا بیٹا شیبہ پیدا ہوا تھا۔ جس کو اس کے چچا مطلب نے پالا اس وجہ سے اسے عبدالمطلب کہا جانے لگا۔ یہی عبدالمطلب مکہ کی سرداری کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان کے دس بیٹے تھے جن میں سے دسویں عبداللہ تھے جن کی شادی بنوزہرہ کے سردار وہب بنت عبد مناف کی بیٹی آمنہ سے ہوئی۔

حضرت عبداللہ اپنی شادی کے چند ماہ بعد انتقال کر گئے اس وقت ان کی بیوی حضرت آمنہ امید سے تھیں۔ آپ سسرال ہی میں رہیں آپ کو اللہ تعالیٰ نے 12 ربیع الاوّل بمطابق اپریل 571ء کو وہ فرزند ارجمند عطا فرمایا جس کو پوری دنیا کے لیے ہادیٔ برحق بننا تھا۔ دادا عبدالمطلب کو اپنے بیٹے عبداللہ سے بے انتہا پیار تھا اور اس بلند بخت بچے سے بھی۔ وہ بچے کو اٹھا کر خانہ کعبہ لے گئے جہاں اللہ تعالیٰ سے بچے کے لیے دعا کی اور نام محمد صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم رکھا۔ ماں نے بچے کا نام احمد صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم تجویز کیا یہ دونوں نام عرب میں پہلے سے متعارف نہ تھے اور ان سے نبی صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی زندگی کا مشن واضح ہوتا تھا یعنی انھوں نے اللہ کی حمد بیان کی اور وہ خود بھی تعریف کے لائق ہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو پہلے چھ ماہ تک ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد عرب کے دستور کے مطابق آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو دودھ پلانے کے لیے حضرت حلیمہؓ کے حوالے کر دیا گیا۔ حضرت حلیمہؓ کا تعلق قبیلہ بنوسعد سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو جو رشد و ہدایت عطا فرمائی تھی اس کا اندازہ ہونے لگا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت حلیمہؓ کے تمام معاملات سیدھے ہونے لگے۔ اونٹنی جس پر وہ سوار تھیں تیز چلنے لگی اونٹنی جو دودھ نہیں دیتی تھی دودھ دینے لگی۔ غرض اس بابرکت بچے کی برکت کو پورا قبیلہ محسوس کر رہا تھا۔ دو سال کے بعد جب بی بی حلیمہؓ آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو لے کر مکہ آئیں تو مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھیں، اس لیے آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی والدہ نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو دایہ حلیمہؓ کے ساتھ ہی واپس بھیج دیا۔ اس طرح آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم نے اپنی زندگی کے ابتدائی پانچ چھ سال صحرائی فضا میں بسر کیے جہاں آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم نے صحرائی زندگی کا تجربہ بھی حاصل کیا اور فصیح عربی زبان بھی سیکھی۔

آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی عمر چھ سال تھی جب آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی والدہ نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کے والد ماجد کی قبر پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سفر میں آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کچھ عرصہ یثرب میں مقیم رہے جبکہ کچھ دیر آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم ابوا میں ٹھہرے جہاں آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کا ننھیالی قبیلہ رہتا تھا۔ یہاں آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی والدہ محترمہ بھی قضائے الٰہی سے وفات پا گئیں

اور حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم دادا حضرت عبدالمطلب کی کفالت میں چلے گئے۔

عبدالمطلب آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور شفقت و محبت سے پیش آتے لیکن یہ سرپرستی بھی آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو زیادہ دیر نصیب نہ ہوئی اور صرف دو برس بعد جب آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی عمر آٹھ سال تھی حضرت عبدالمطلب بھی وفات پا گئے اور آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی پرورش کی ذمہ داری چچا ابوطالب کے کندھوں پر آ پڑی جو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سگے چچا تھے۔

آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اس دور کا ایک قابلِ ذکر واقعہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی برکت سے بارش کا نزول اور قحط سالی کا خاتمہ ہے۔ جب مکہ والے مسلسل قحط سالی سے تنگ آ گئے تو حضرت ابوطالب سے استدعا کی کہ وہ بارانِ رحمت کی دعا کریں چنانچہ حضرت ابوطالب حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ساتھ لے کر خانہ کعبہ پہنچے اور بارش کی دعا کی۔ قبولیتِ دعا کے بعد ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ شہر و بیابان شاداب ہو گئے۔ حضرت ابوطالب نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی مدح کی تھی ''وہ خوبصورت ہیں ان کے چہرے سے بارش کا فیضان طلب کیا جاتا ہے۔ یتیموں کے ماویٰ اور بیواؤں کے محافظ ہیں۔''

لڑکپن اور اوائلِ جوانی میں حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے سخت کوشی کی زندگی گزاری۔ گلہ بانی کا پیشہ اختیار کیا۔ اُجرت پر جانور چرائے نیز دوسروں کے مال سے تجارت کر کے معاوضہ حاصل کیا۔ جفاکشی کے اس دور سے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے محنت سے رزقِ حلال حاصل کرنے کی تربیت پائی۔

جنگِ فجّار

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی عمر پندرہ سال تھی جب قریش و بنو کنانہ اور بنو قیس کے درمیان جنگ لڑی گئی جسے ''جنگِ فجار'' کہتے ہیں۔ یہ جنگ حرام مہینوں (ایسے مہینے جن میں جنگ کا لڑنا ممنوع قرار دیا گیا ہے) میں لڑی گئی اس لیے اسے فاجروں کی جنگ کا نام دیا گیا۔ اس جنگ میں قریش حق پر تھے اس لیے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بھی اس جنگ میں شریک تھے لیکن آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ صرف اپنے چچاؤں کو جو قریش کے سردار تھے تیر پکڑاتے رہے۔

حلف الفضول

جنگِ فجار کے تھوڑے عرصہ بعد مکہ میں یہ واقعہ پیش آیا۔ بنو زبیدہ کا ایک تاجر کچھ مال لے کر مکہ آیا۔ عاص بن وائل نے اس سے بہت سا مال خریدا لیکن بعد میں اس کی قیمت دینے کے بجائے ٹال مٹول کرنے لگا۔ تاجر نے ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس ظلم کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ اس کے درد بھرے اشعار سے متاثر ہو کر زبیر بن عبدالمطلب نے تمام قبائل کے سرداروں سے رابطہ کر کے انھیں جمع کیا اور ان کے درمیان یہ معاہدہ کروایا کہ مکہ میں ہر مظلوم کی مدد کی جائے گی خواہ اس کا تعلق مکہ سے ہو یا وہ باہر سے آیا ہوا ہو۔ اس معاہدے کی وجہ سے عاص بن وائل تاجر کی رقم دینے پر مجبور ہو گیا۔ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس معاہدے کے بارے میں

فرمایا تھا کہ مجھے جب بھی اس طرح کے کسی معاہدے کے لیے بلایا جائے گا تو میں اس میں ضرور شریک ہوں گا۔

شادی

گلہ بانی کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے تجارت کا پیشہ اختیار کرلیا تھا۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم متمول لوگوں کے مال سے کاروبار کرتے تھے۔ جلد ہی آپ کی دیانت اور صلاحیت سے لوگ متاثر ہونے لگے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے صادق وامین ہونے کی شہرت حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک پہنچی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اپنے غلام میسرہ کی معیت میں ایک تجارتی سفر کے لیے آمادہ کرلیا۔ میسرہ نے سفر سے واپسی پر آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حسنِ اخلاق، دیانتداری اور کاروباری صلاحیت کی بھرپور تعریف کی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دورانِ سفر آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے طرزِ عمل کی تفصیلات بتائیں چنانچہ انھوں نے بزرگوں کی وساطت سے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو شادی کا پیغام بھیجا جو حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قبول فرمالیا۔

شادی کے وقت حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی عمر 25 سال اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی 40 سال تھی۔ جب تک حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زندہ رہیں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے کوئی اور شادی نہ کی۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بیشتر اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کے بطن سے تھی۔

آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا اکثر وقت تلاشِ حق میں صرف ہوتا تھا۔ تنہائی میں یادِ الٰہی اور تدبر معمول بن گیا تھا۔ سنجیدگی، صدق، امانت، خوش اخلاقی اور بصیرت کی وجہ سے ہر خاص وعام آپ کا مداح بن گیا تھا۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم حسبِ ضرورت لوگوں سے ملاقات کرتے عبادت کے لیے خانہ کعبہ تشریف لے جاتے اور اس کے بعد مکہ سے باہر غارِ حرا میں جا کر اللہ کو یاد کرتے۔

تنصیبِ حجرِ اسود

اسی زمانے میں قریش مکہ نے خانہ کعبہ کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا چنانچہ طے پایا کہ قریش رزق حلال سے خانہ کعبہ کو دوبارہ تعمیر کریں گے۔ جب حجرِ اسود کی تنصیب کا وقت آیا تو قبیلوں کے سرداروں کے درمیان رقابت اور تلخی پیدا ہوگئی۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ جنت کے اس پتھر کو اپنی جگہ پر نصب کرنے کا اعزاز اسے حاصل ہو۔ قریب تھا کہ اس مسئلہ پر جنگ کی نوبت آجائے کہ ابواُمیہ مخزومی نے یہ تجویز پیش کی کہ اس مسئلے کے حل کے لیے اس شخص کا حکم مان لیا جائے جو سب سے پہلے حرم میں داخل ہو۔ اس مسئلے کے حل کی سعادت حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو حاصل ہوئی۔ جب آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم حدودِ حرم میں داخل ہوئے تو سب نے با آواز بلند پکار کر کہا ”یہ امین ہیں ہم ان پر راضی ہیں، یہ محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں“ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے سب سے برتری کے دعوے سنے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک چادر طلب کی، حجرِ اسود کو اٹھا کر اس چادر پر رکھا اور سب سرداروں سے کہا کہ اس چادر کے کنارے پکڑو اور حجرِ اسود کو اس کے مقام کی طرف لے کر چلو اس کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حجرِ اسود کو اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دیا اس طرح سب قبائل اس سعادت میں شریک ہوگئے اور سب کا دل مطمئن ہوگیا۔

آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا پاکیزہ اخلاق اور صحیح عقائد سے شروع سے متصف تھے۔ کفر و شرک اور معاصی سے طبعی نفرت تھی۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی مکی زندگی

حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم مکہ کے مشرکانہ معاشرے سے سخت بیزار تھے۔ ان کی طبیعت ہر ظلم پر کڑھتی تھی۔ اس معاشرت سے طبیعت اچاٹ ہونے لگی تو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم مکہ سے دو میل دُور غارِ حرا میں جا کر عبادت کرنے لگے۔

نزولِ وحی کا آغاز

جب آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی عمر مبارک چالیس سال ہوگئی تو ماہ رمضان کی ایک رات آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم غارِ حرا میں عبادت و بندگی اور ذکر وفکر میں مصروف تھے اس دوران حضرت جبریل علیہ السلام آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے پاس آئے اور آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے کہا پڑھیے آپ نے فرمایا میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ حضرت جبریل علیہ السلام تین بار یہ کہا۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے تینوں بار یہی جواب دیا۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات پڑھیں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ان کے ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے۔ سورۃ العلق کی ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

''اپنے اُس پروردگار کے نام سے پڑھیے جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے آپ (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) کا پالنے والا بڑی عزت والا ہے جس نے قلم سے تعلیم دی اور انسان کو وہ پڑھایا جو اسے معلوم نہ تھا''۔

اس واقعہ کے بعد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم گھر تشریف لائے تو اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا ''مجھے چادر اوڑھا دو''۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے چادر اوڑھا دی تو فرمایا مجھے کیا ہوگیا ہے مجھے تو اپنی جان کا ڈر لگتا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تسلی دیتے ہوئے کہا ''اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو رسوا نہیں کرے گا۔''

تھوڑی دیر کمبل اوڑھنے کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حالت بہتر ہوگئی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو مشرکانہ نظریات سے بغاوت کرکے عیسائی مذہب قبول کر چکے تھے، انھوں نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے نبی برحق ہونے کی بشارت دی۔

نزولِ وحی کے بعد تھوڑے عرصے تک وحی نازل نہ ہوئی تو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بے چین ہوگئے۔ یہاں تک کہ سورۂ مدثر کی یہ آیات نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے نبوّت آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سپرد کردی۔

ترجمہ: ''اے اوڑھنی لپیٹ کر لیٹنے والے۔ اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو''

دعوتِ اسلام اور قریش مکہ کی مخالفت

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سیرت کا یہ اعجاز ہے کہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے قریب ترین لوگ سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ عورتوں میں سب سے پہلے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زوجہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بچوں میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب اور غلاموں میں زید بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہوئے۔

تبلیغ اسلام میں سب سے زیادہ مؤثر کردار حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ادا کیا۔ چنانچہ ان کے ذریعے حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت زبیرؓ بن عوام، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت طلحہؓ بن عبداللہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور یہ سب عشرہ مبشرہ (جن کو دنیا میں جنت کی بشارت دی گئی تھی) میں سے تھے ان کے علاوہ حضرت بلالؓ حبشی، حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح اور عبداللہؓ بن مسعود نے بھی اسی دور میں اسلام قبول کیا۔

شروع میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ان سرگرمیوں کا نوٹس نہ لیا گیا لیکن رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافے سے اکابرینِ قریش کو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سرگرمیوں پر تشویش لاحق ہوئی چنانچہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قریش کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے کوہِ صفا پر چڑھ کر سارے قبائل کو نام لے لے کر پکارا (یہ طریقہ اس وقت اختیار کیا جاتا تھا جب کسی خطرہ سے آگاہ کرنا ہو) جب سب جمع ہو گئے تو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ان سے پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے شاہسواروں کا ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے جمع ہے تو کیا تم مان لو گے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم ضرور مانیں گے کیونکہ ہم نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ہمیشہ سچ بولتے پایا ہے۔ اپنی صداقت کی تصدیق کروانے کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا ''میں آپ کو ایک سخت عذاب سے پہلے خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اے بنی کعب اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔'' اگرچہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے پُرسوز انداز میں فکرِ آخرت کی دعوت دی مگر ابولہب نے سب سے پہلے اس کا جواب دیا۔ ''کیا تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا؟'' اور اس کے بعد انھیں کوستا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ باقی مجمع نے کوئی جواب نہ دیا اور منتشر ہو گیا۔ اس کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے دعوتِ اسلام کو کھلم کھلا بیان کرنا شروع کیا۔ قریشی سرداروں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو حضرت ابو طالب کی سرپرستی حاصل ہے اس لیے بنو ہاشم ہر صورت میں ان کا دفاع کریں گے۔ ابوطالب پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ایک قریشی وفد نے ان سے جا کر کہا کہ آپ کے بھتیجے نے ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہا ہے۔ ہمارے دین پر نکتہ چینی کی ہے اور ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ قرار دیا ہے۔ اس لیے یا تو اس کو منع کر لیں یا اس کے اور ہمارے درمیان سے ہٹ جائیں، ہم اس سے خود نپٹ لیں گے۔ تاہم ابو طالب نے ان کا کوئی مطالبہ مانے بغیر انھیں واپس بھیج دیا۔

مشرکین مکہ نے مصالحتی کوشش کے ناکام ہونے کے بعد حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بھرپور مخالفت شروع کر دی۔ غریب مسلمانوں پر ظلم ڈھایا جانے لگا۔ اہلِ مکہ کی ظالمانہ کارروائیوں نے زور پکڑا تو آپ دارِ ارقم میں مقیم ہو گئے جو نسبتاً محفوظ مقام تھا۔

ہجرتِ حبشہ

ظلم و جور انتہا کو پہنچنے لگا تو اعلانِ نبوّت کے پانچویں سال 12 مردوں اور 4 عورتوں پر مشتمل ایک قافلے نے رات کی تاریکی میں ساحلِ سمندر کا رخ کیا اور ایک تجارتی کشتی کے ذریعے حبشہ جا پہنچے جہاں کا عیسائی بادشاہ نجاشی (اصل نام اصحمہ) ایک عادل حکمران تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ظلم بڑھتا گیا یہاں تک کہ مجبوراً حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ارشاد پر 83 مردوں اور 18 یا 19 عورتوں پر مشتمل ایک دوسرے قافلے نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ مکہ والوں کی پوری کوشش کے باوجود انھیں راستے میں نہ روکا جا سکا تو

عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ پر مشتمل ایک وفد حبشہ بھیجا گیا جس نے پہلے حبشہ کے مذہبی پیشواؤں کو تحفے تحائف دیے، پھر نجاشی کے دربار میں پیش ہوکر مطالبہ کیا کہ ہمارے کچھ لوگ جنھوں نے ایک نیا دین ایجاد کرلیا ہے اور آپ کے ملک میں آ گئے ہیں۔ ہم ان کے اہلِ خاندان کی طرف سے یہ درخواست لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ ان کو ہمارے ساتھ واپس بھیج دیا جائے۔ نجاشی نے مہاجرین کو بلا بھیجا۔ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے حضرت جعفرؓ طیار نے بادشاہ کے سامنے اپنے دین کی پاکیزہ دعوت اور مکہ والوں کے ساتھ اپنے اختلافات پر روشنی ڈالی۔ نجاشی نے مہاجرین کو برحق قرار دے کر اہلِ مکہ کے وفد کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ اگلے روز عمرو بن العاصؓ نے نجاشی سے کہا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں بھی عجیب وغریب باتیں کرتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کو پھر بلایا اور پوچھا کہ حضرت مریم علیہا السّلام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے جواب میں سورہ مریم تلاوت کی۔ نجاشی عربی سمجھتا تھا وہ سن کر آبدیدہ ہوگیا اس کے سوال پر کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں حضرت جعفر طیارؓ نے بتایا کہ ''حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا وہ کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری پاکدامن حضرت مریم علیہا السّلام کی طرف القا کیا تھا'' نجاشی نے ایک تنکا زمین سے اٹھایا اور کہا ''خدا کی قسم جو تم نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اس سے تنکا بھر بھی زیادہ نہیں ہیں''۔ اس طرح مکہ کا سفارتی وفد ناکام واپس لوٹا۔

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام نے قریش کو ہلا کر رکھ دیا۔ کفر کے قلعہ میں بہت بڑا شگاف پڑ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کے بعد ان کے ایما پر تمام مسلمان دارِ ارقم سے باہر آئے اور حرم میں داخل ہوئے اور سرِ عام نماز پڑھی اور حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے آپؓ کو ''فاروقؓ'' کا خطاب دیا۔

شعبِ ابی طالب

حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کے قبول اسلام کے بعد سرداران قریش کو یہ بات تو سمجھ آ گئی کہ نئے دین کو تشدد سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مذاکرات سے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو منانے کی کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی تو انھوں نے سماجی دباؤ کا حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور نبوت کے ساتویں سال ایک معاہدہ کیا گیا کہ بنو ہاشم کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے نہ ان سے خرید وفروخت ہوگی نہ رشتہ داری۔ اس معاہدے کو خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔ یہ دور مسلمانوں اور بنو ہاشم پر بہت سختی کا دور تھا۔ بالآخر نوجوانانِ قریش میں سے ایک شخص ہشام بن عمرو نے اس ظلم کے خلاف فضا تیار کرتے ہوئے لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور اس معاہدے کو جو خانہ کعبہ کے اندر لٹکا ہوا تھا پھاڑ دیا۔ یہاں یہ معجزہ بھی قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیڑوں نے اللہ کے نام کے سوا باقی سارے معاہدے کو چاٹ کر بوسیدہ کر دیا تھا۔ اس معاہدے کے پھٹنے سے مسلمان گھاٹی سے باہر آ گئے لیکن ان کے لیے مکہ میں تبلیغ اسلام ناممکن بنا دی گئی تھی۔

عام الحزن

آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اپنے چچا حضرت ابو طالب کی حمایت حاصل تھی جن کی وجہ سے بنو ہاشم اور بنو مطلب آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حفاظت کرتے تھے۔

دُوسرا دنیوی سہارا حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی ذات تھی جن کے مکہ کے بیشتر لوگوں پر احسانات تھے اور معاشرتی روایات کے تحت وہ ان کے خاوند کا لحاظ کرنے پر مجبور تھے لیکن 10 نبوی میں یہ دونوں سہارے چھن گئے اور دونوں ہی اللہ کو پیارے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی کفارِ مکہ کی طرف سے ظلم کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ اس سال کو حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ''عام الحزن'' یعنی غم کا سال قرار دیا۔

سفرِ طائف

شوال 10 نبوی میں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم طائف تشریف لے گئے۔ یہاں قبیلہ بنو ثقیف بستا تھا جس کی قیادت تین بھائی عبد یا لیل، مسعود اور حبیب کے ہاتھ میں تھی۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی مگر تینوں نے انتہائی سخت الفاظ میں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے سرداروں سے مایوس ہو کر عوام کو دعوت دینی شروع کی تو ان سرداروں نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو تنگ کرنے کے لیے آوارہ نوجوانوں کو بھیجا جنھوں نے پتھر مار مار کر آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو لہولہان کر دیا۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تھک ہار کر بیٹھ جاتے یا نڈھال ہو کر گر جاتے تو ایک بدبخت آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اٹھا کر چلا دیتا اور پھر پتھروں کی بارش ہونے لگتی۔ اسی حالت میں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم طائف سے باہر نکلے اور انگوروں کے ایک باغ میں پناہ لی جو مکہ کے ایک سردار عتبہ بن ربیعہ کا تھا اس حالت میں بھی آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے طائف کے لوگوں کے لیے بددعا کرنے کی بجائے ان کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی۔

واقعہ معراج

ایک رات حضرت جبرائیل علیہ السّلام نے حکمِ خداوندی کے تحت براق پر سوار کرایا اور مسجدِ حرام سے بیت المقدس لے گئے جہاں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے نے انبیاء کرام کی نماز کی امامت کروائی اور پھر وہاں سے عالمِ بالا کا سفر شروع ہوا جہاں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کروایا گیا۔ بدکردار لوگوں کا انجام دکھایا گیا، مختلف انبیا کرام سے تعارف کرایا گیا، نماز پنجگانہ کا تحفہ اور سورۃ بقرہ کی آخری تین آیات عطا کی گئیں۔ اس واقعہ نے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ''عین الیقین'' کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

بیعت عقبہ اولیٰ و ثانی

مکی دور کے آخر میں یثرب کی سرزمین تیزی سے نورِ اسلام سے منور ہو رہی تھی۔ 12 نبوی میں یثرب کے 12 آدمی حج کے موقعہ پر حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ہاتھ پر بیعت کی جسے عقبہ اولیٰ کا نام دیا جاتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو وفد کے ہمراہ یثرب روانہ کیا تاکہ وہ انھیں اسلام کی تعلیم دے سکیں۔ اگلے سال 73 مردوں اور 2 عورتوں پر مشتمل وفد نے اسی مقامِ عقبہ پر دوبارہ حاضری دی اور حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو یثرب آنے کی دعوت دی۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی مکی زندگی آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی پاکیزگی، اعلیٰ صلاحیتوں، شرافت، ذہانت اور حسن اخلاق کی

مظہر ہے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے پوری دِلسوزی اور دلائل کے ساتھ شرک چھوڑنے کی تلقین کی، آخرت کا واضح تصوّر دیا، ظلم کو چھوڑنے، رشتہ داروں، مسکینوں اور غریبوں کے حقوق ادا کرنے اور اللہ کے دین کے مطابق زندگی گزارنے کی دعوت دی لیکن جب مکہ کی سرزمین میں قبولِ حق کی صلاحیت ختم ہوتی نظر آئی تو اللہ نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو دوسرا مرکز مدینہ عطا فرما دیا جہاں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ حضرت عباسؓ بھی تھے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ حضرت عباسؓ نے اس کے پُرخطر نتائج سے آگاہ کیا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جن باتوں پر بیعت لی ان میں سے اطاعتِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی راہ میں خرچ کرنا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اللہ کی راہ میں جہاد اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے محبت اہم ہیں۔

آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس معاہدے میں واضح فرمایا کہ تم یہ معاہدہ نبھاؤ، تمھارے لیے جنت ہوگی۔ یثرب کے مسلمانوں نے یہ وعدہ بھی لیا کہ جب اللہ تعالیٰ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو غلبہ عطا فرما دے تو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم واپس مکہ نہیں آئیں گے بلکہ ہمارے ساتھ مدینہ ہی میں رہیں گے۔

ہجرتِ مدینہ

محمد مصطفی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ایک عظیم مقصد لے کر اس دنیا میں آئے تھے اور آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس مقصد کی تکمیل کا عزمِ صمیم کر رکھا تھا۔ شعبِ ابی طالب کے بعد مکہ کے حالات ایسے تھے کہ مکہ میں اسلام کی مزید اشاعت ممکن نہ رہی تھی۔ سوائے حج کے موقعہ پر جب تشدد کی کارروائی مشرکینِ مکہ کے نزدیک بھی قابلِ مذمت تھی، آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم قبائلِ عرب کو اسلام کی دعوت دے سکتے تھے لیکن کفارِ مکہ کی اسلام کے خلاف منظم سازشوں کے باعث اس تبلیغ کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے تھے۔ لہٰذا ایک نئے مرکز کی اشد ضرورت تھی جہاں اسلام زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلایا جا سکے۔

یثرب کے دارالہجرت بننے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ یہاں کے لوگ تیزی سے مشرف بہ اسلام ہو رہے تھے۔ یثرب میں یہودیوں کی کثیر تعداد آباد تھی جس کے یہاں آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان کی کتابوں میں ''نجات دہندہ'' کی آمد کی جو پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ ان کے مطابق اسے اسی شہر میں وارد ہونا تھا۔ بنو اوس و بنو خزرج کے جن لوگوں نے مکہ میں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے ملاقات کی، انھیں سمجھ آ گئی کہ یہ وہی نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں جن کا ذکر یہودانِ مدینہ کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہودی نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بیعت کرنے میں ان سے آگے نہ بڑھنے پائیں۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ واپسی پر اسلام کی اشاعت کے لیے بھرپور کوششیں بھی شروع کر دیں۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کو معلمِ اسلام بنا کر بھیجا گیا تو ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور بہت سے بااثر لوگ بھی مشرف بااسلام ہو گئے جن میں سعدؓ بن معاذ اور سیدؓ بن حضیر جیسے سردار بھی شامل تھے۔

نبوّت کے تیرھویں سال یثرب کے 70 مسلمانوں نے فریضہ حج ادا کیا اور منیٰ کے ایک خفیہ مقامِ عقبہ میں رات کی تاریکی میں

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم یثرب تشریف لے آئیں، ہم آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ویسے ہی حفاظت کریں گے جیسے اپنے بچوں کی کرتے ہیں، جان و مال اور ہر طرح کی قربانی دیں گے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے چچا عباس جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بھی اس موقعہ پر موجود تھے۔ اہل یثرب کا جوش وجذبہ قابل قدر تھا اس لیے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے یثرب کی طرف ہجرت کا فیصلہ فرمالیا۔

ہجرتِ حبشہ کی مثال

شدتِ مظالم کی وجہ سے مسلمان حبشہ ہجرت کر گئے اور کئی ایک صحابہ نے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سامنے فریاد کی اور پُوچھا کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟

دوسری طرف جو مسلمان حبشہ ہجرت کر گئے تھے وہ نہ صرف پرسکون زندگی گزار رہے تھے بلکہ اسلام کی اشاعت بھی کر رہے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ مکہ سے باہر اللہ کے دین کو پھیلانے کے بہتر مواقع موجود ہیں۔ اس کامیاب تجربے سے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

یثرب کی جغرافیائی حیثیت

یثرب اس شاہراہ پر واقع تھا جو شام کی طرف جاتی تھی اور جہاں سے اہل مکہ کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ یثرب منتقل ہو جانے سے مسلمانوں کو مکہ والوں پر معاشی دباؤ ڈالنے کا موقع بھی حاصل ہو جاتا۔ جغرافیائی لحاظ سے مدینہ کے اردگرد واقع پہاڑی اور حفاظتی دیوار والے باغات کسی بھی وقت مدینہ کو مضبوط قلعہ بنا سکتے تھے۔

حکمِ الٰہی

بیعتِ عقبہ ثانی کے بعد مسلمان یثرب کا رخ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ صرف حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ مکہ میں رہ گئے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

بیعتِ عقبہ ثانی کے تقریباً اڑھائی ماہ بعد 26 صفر کو سردارانِ مکہ دارالندوہ میں جمع ہوئے اور اس بات پر غور کرنے لگے کہ مسلمانوں کے یثرب چلے جانے کے بعد ان کے مفادات کو جو خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ اس اجلاس میں بہت سی تجاویز کے بعد بالآخر ابوجہل کی اس تجویز پر اتفاق رائے ہوا کہ تمام قبیلوں میں سے ایک ایک جوان لے کر ایک دستہ تیار کیا جائے جو رات کو حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مکان کو گھیر لے اور جب وہ صبح باہر نکلیں تو مل کر ان پر حملہ آور ہو کر نعوذ باللہ ان کا خاتمہ کر دیں۔ بنو ہاشم باقی سب قبیلوں کے خلاف لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، اس لیے وہ خون بہا لے کر چپ ہو رہیں گے۔ اس ناپاک سازش میں جو رات حملے کے لیے طے کی گئی۔ اسی رات اللہ تعالیٰ نے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو مکہ سے ہجرت کا حکم دیا اور آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں مکہ سے روانہ ہوئے۔ ایک طرف قریش کے سردار اپنی منصوبہ بندی میں مصروف تھے دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ہجرت کی ہدایت کی۔

ہجرتِ مدینہ

واقعات

آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم آدھی رات کے وقت اپنے گھر سے باہر نکلے اور حضرت ابوبکرؓ کے گھر پہنچے اور ان کے گھر کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئے اور بجائے یثرب کی طرف سیدھا شمال کا رخ کرتے، جنوب کی طرف روانہ ہوئے جہاں مکہ سے تین میل دُور غارِ ثور میں قیام کیا۔

دوسری طرف محاصرہ کرنے والے صبح مکان کے اندر داخل ہوئے تو انھوں نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بستر پر حضرت علیؓ کو سوئے ہوئے پایا جن کو حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس لیے پیچھے چھوڑا تھا کہ وہ مکہ والوں کی امانتیں واپس کر دیں جو ہزار اختلاف کے باوجود آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہی کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔

کفارِ مکہ نے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور صدیق اکبرؓ کی گرفتاری کے لیے یہ اعلان کیا کہ جو کوئی ان میں سے کسی ایک کو زندہ یا مردہ کسی صورت میں حاضر کرے گا اسے سو سرخ اونٹ انعام دیا جائے گا۔ انعام کے لالچ میں سوار اور پیادے ہر طرف پھیل گئے۔ ان میں سے ایک گروہ غارِ ثور کے دہانے تک جا پہنچا۔ یہ لوگ اگر اپنے پاؤں کی طرف بھی دیکھ لیتے تو وہ دونوں رفیقوں کو دیکھ سکتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس پر گھبراہٹ کا اظہار کیا تو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا ''مت غم کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔ انعام کے لالچ میں تلاش کرنے والے مسلسل تعاقب کر رہے تھے۔ ان میں سے سراقہ بن جعشم آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا لیکن حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا گر گیا۔ اس نے دوبارہ حملے کا ارادہ کیا تو گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک ریت میں دھنس گئے اور اسے سمجھ آ گئی کہ اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر حملہ کرنا اُس کے بس کی بات نہیں۔ اس نے ضروریاتِ سفر مہیا کرنے کی پیش کش کی نیز یہ درخواست بھی کی کہ اسے ایک امان نامہ لکھ دیا جائے کہ جب آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا اقتدار آئے تو اُسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ایک ہفتہ کے سفر کے بعد 8 ربیع الاول 14 نبوی 23 ستمبر 622ء کو یثرب کی نواحی بستی ''قبا'' پہنچے۔ اہلِ یثرب نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا والہانہ استقبال کیا۔ تین دن بعد حضرت علیؓ بھی لوگوں کی امانتیں لوٹا کر یہیں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے آ ملے۔ یہاں پہلی مسجد ''مسجدِ قبا'' کی بنیاد رکھی گئی اور یہیں جمعہ کی پہلی نماز پڑھی گئی۔ چند روز قیام کے بعد یثرب پہنچے اور اپنے ننھیالی قبیلہ بنو نجار کے ایک شخص حضرت ابوایوب انصاریؓ کو میزبانی کا شرف بخشا اور یثرب مدینۃ النبیؐ (یعنی نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا شہر) قرار پایا۔

ہجرتِ مدینہ کی اہمیت اور اثرات

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی مدینہ آمد ایک مثالی معاشرے کی تخلیق کا سبب بنی جس میں مساوات، بھائی چارہ، محبت اور ہمدردی

کے جذبات موجزن تھے، نہ کوئی قبائلی چپقلش تھی اور نہ ہی خانہ جنگی۔

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد نہ صرف مدینہ کے لوگوں میں بلکہ ارد گرد کے قبائل میں بھی اسلام تیزی سے پھیلنے لگا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ ہجرت مدینہ صرف جان بچانے کی تدبیر نہ تھی بلکہ اسلامی انقلاب کی تکمیل کے لیے ایک ضروری قدم تھا۔

مدینہ میں آباد عرب قبائل بنو اوس و بنو خزرج آپس میں لڑتے رہتے تھے اور باہمی لڑائی میں یہودی قبیلوں سے مدد بھی لیتے تھے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی قیادت کو ماننے کے معنی یہ تھے ان کے درمیان دشمنی ختم ہوگئی اور سب مل کر ایک مشترکہ مقصد اسلام کے فروغ کے لیے سرگرم ہو گئے۔ ہجرت کے نتیجہ کے طور پر اسلام جو اب تک ایک تحریک تھی، اب ریاست بن گیا۔ ایک ایسی ریاست، جس کے سربراہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تھے جن کا فیصلہ آخری تھا۔

مدینہ میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کی تشکیل کے ساتھ ہی وہ تمام احکام بھی نازل ہوئے جن کا تعلق اسلامی ریاست کے نظام کے ساتھ تھا۔ اسلامی قانون کی مختلف دفعات بھی نازل ہوئیں۔ تربیت کا ایک جامع اور مربوط نظام وجود میں آیا۔ شراب حرام قرار پائی، سود پر پابندی لگی، نماز باجماعت اور اذان کا نظام، مشاورت کا طریقہ، صلح جنگ کے قوانین، غرض اسلام کے نظامِ حیات کے مختلف خدوخال واضح ہوئے۔

مدینہ کی جغرافیائی اہمیت یہ تھی کہ وہ راستہ جس کے ذریعے اہلِ مکہ یمن سے شام تک بین الاقوامی تجارت کرتے تھے، مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے مدینہ کی نئی اسلامی ریاست کسی وقت بھی مکہ پر معاشی دباؤ ڈال سکتی تھی۔

جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے ایک طرف مدینہ کے خلاف اہل مکہ زیادہ دیر تک جنگ جاری نہیں رکھ سکتے تھے تو دوسری طرف مدینہ کے ارد گرد پہاڑیوں اور حفاظتی دیوار والے باغات کی وجہ سے مدینہ میں رہ کر دفاع کیا جا سکتا تھا۔ اس زمانے میں ایران و روم دو بین الاقوامی طاقتیں تھیں۔ مدینہ کی یہ نئی ریاست جلد ہی اتنی مضبوط ہوگئی کہ اسے تیسری بڑی طاقت تسلیم کر لیا گیا اور تاریخ کے بعد کے ادوار میں یہ نئی ابھرنے والی طاقت باقی دونوں پر غالب آ گئی اور یہیں سے سنِ ہجری کا آغاز ہوا۔

میثاقِ مدینہ

مدینہ تشریف آوری کے بعد حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مؤاخاتِ مدینہ کے ذریعے بھائی چارے کی فضا پیدا کر دی۔ مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تعمیر سے مدینہ ایک معاشرتی و سیاسی مرکز بن گیا اور سیاسی تنظیم کے لیے مدینہ میں آباد تمام فریقوں کو اکٹھا کر کے ایک معاہدہ کیا گیا جسے ''میثاقِ مدینہ'' کا نام دیا گیا۔

معاہدے میں مہاجرین، انصارِ مدینہ یعنی مدینہ کے مسلمان، مدینہ میں آباد دیگر لوگ جنھوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا اور یہود کے تینوں قبیلے (بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ) شامل تھے۔ ان سب کو ایک سیاسی وحدت قرار دیا گیا تھا۔ معاہدہ میں شامل فریقوں، یہاں تک کہ یہودیوں کو تمام مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ معاہدہ میں شامل فریقوں کے جن دوسرے قبائل کے ساتھ برادرانہ

تعلقات ہیں ان کو ان ہی کی طرح حقوق حاصل تھے۔

مدینہ کو ''حرم'' کا درجہ دے دیا گیا یعنی اسے ''امن کا گھر'' قرار دیا گیا۔ کسی شہری کے قتل پر قصاص لیا جائے گا تاہم اگر مقتول کے وارث خون بہا لینے پر آمادہ ہوں تو قاتل قتل ہونے سے بچ جائے گا لیکن اسے یا اس کے وارثوں کو خون بہا ادا کرنا ہوگا۔ کسی شخص کے بُرے فعل کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔ اس کا حلیف یا کوئی رشتہ دار اس کے برے فعل کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ معاہدہ میں شامل کوئی فریق اگر حالتِ جنگ میں ہو تو اس کی مدد کے لیے تمام فریق باہم صلاح مشورہ کریں گے۔ ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی برقرار رکھی جائے گی اپنی جنگ کے مصارف ہر فریق خود اٹھائے گا۔ یہود کی طرف سے صُلح کی دعوت قبول کی جائے گی البتہ اس شق کا اطلاق اس جنگ پر نہیں ہوگا جو خالص دین کی خاطر کی جا رہی ہو۔ مدینہ پر حملہ کی صورت میں یہودی اور مسلمان مل کر دفاع کریں گے۔ قریش یا ان کے کسی معاون کو پناہ نہیں دی جائے گی۔ اس معاہدہ میں شریک فریقوں کے درمیان اگر کوئی تنازعہ یا اختلاف پیدا ہو جائے یا کسی مسئلہ پر فتنہ وفساد پیدا ہونے کا خدشہ ہو تو اس کے فیصلے کے لیے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی طرف رجوع کیا جائے گا اور آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا فیصلہ آخری ہوگا۔

میثاقِ مدینہ کی اہمیت

میثاقِ مدینہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے جس میں ریاست میں شامل مختلف اکائیوں کے حقوق وفرائض کا تعین کیا گیا۔ میثاقِ مدینہ نے مدینہ کو ایک منظم ریاست کی شکل دی اور چونکہ اس میں آخری فیصلے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو دیا گیا اس لیے یہ ریاست اسلامی ریاست تھی۔

میثاق مدینہ نے ان لوگوں کو بھی مساوی اور منصفانہ حقوق دیے جو یہودی و نصرانی تھے یا اوس وخزرج کے وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا اس طرح مذہبی رواداری کے اصول کو پہلی مرتبہ دستوری شکل دی گئی۔ میثاقِ مدینہ، وفاق کے اصول پر ریاست کو منظم کرتا تھا۔ میثاقِ مدینہ نے ریاست میں امن وامان کی فضا پیدا کر دی۔ اس زمانے کے جاہل معاشرے میں یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ امن وامان کی اس فضا میں لوگوں کو اسلام پر غور کرنے کا موقعہ ملا تو لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ بہت جلد اوس وخزرج کے تمام لوگ اسلام لے آئے نیز اردگرد کے قبائل بھی اس ریاست میں شامل ہونے لگے جس سے اسلامی ریاست کی وسعت دس گنا ہو گئی۔

قریشِ مکہ جو اپنے معاشی، سیاسی اور مذہبی مفادات کی خاطر اسلام کی مخالفت میں اندھے ہو چکے تھے، اب مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ میثاقِ مدینہ نے مدینہ کو ایک منظم ریاست بنا دیا تھا۔ مسلمان اب قریش کے حملوں کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ چنانچہ اگلے چند سالوں ہی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ مدینہ کی اسلامی ریاست ناقابلِ تسخیر ہے اور قریش تمام دوست قبائل اور خیبر کے یہودیوں کی مدد حاصل کر کے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔

غزوۂ بدر (2ھ بمطابق 624ء)

اسباب

1- کفارِ مکہ کی اسلام دشمنی

مکہ میں حق و باطل کی کشمکش تیرہ سال تک جاری رہی تھی لیکن نورِ حق کو مٹانے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی ہجرت مدینہ سے بھی کفارِ مکہ کو چین نہ آیا کیونکہ ان کی آنکھوں کے سامنے اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا۔ لہٰذا انھوں نے مدینے کی اسلامی حکومت کو ختم کرنے کے لیے اپنی منصوبہ بندی تیز کردی۔

2- یہودیوں کے ساتھ ساز باز

کفار کے سرداروں نے نئی قائم ہونے والی اسلامی حکومت کو ناکام کرنے کے لیے مشرکینِ مدینہ سے رابطہ قائم کیا اور انھیں کہا کہ محمد صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم پوری قوت کے ساتھ تم پر حملہ کردیں گے اور تمھارے لیے مقابلہ مشکل ہوجائے گا تاہم انصار مدینہ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی بلکہ ان قبیلوں کے وہ لوگ جو ابھی مشرک تھے، نے بھی سرداران مکہ کی بات ماننے سے انکار کردیا۔ سردارانِ قریش نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ ساز باز شروع کردی اس طرح کشیدگی کی جو فضا پیدا ہوئی اس کا نتیجہ "بدر" کی جنگ کی صورت میں نکلا۔

3- اشاعتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں

دوسری طرف مسلمان بھی محسوس کررہے تھے کہ قریش سرداروں کا طرزِ عمل اسلام کی اشاعت میں رکاوٹ ہے کیونکہ وہ نہ صرف ہر اس قافلے کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے جو اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ جارہا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ان سفارتوں کو بھی مدینہ پہنچنے میں رکاوٹ ڈالتے جو مختلف اطراف سے اسلامی حکومت کی طرف جاتیں۔ یمن سے مدینہ جانے والی سفارت، جس کی قیادت عبدالقیس کررہا تھا، کے رُکنے سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ جب تک مکہ و مدینہ کے درمیان کش مکش کا فیصلہ نہیں ہوجاتا، اشاعتِ اسلام کی راہیں مسدود رہیں گی۔

4- مدینہ کی معاشی ودفاعی اہمیت

اہل مکہ کے لیے اسلام کی قوت معاشی لحاظ سے بھی خطرناک ہوگئی تھی کیونکہ مکہ اور شام کے درمیان جو شاہراہ تھی اس پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم نے اس امر کا احساس کفار مکہ کو دلانے کے لیے کئی ایک مہمات بھی روانہ فرمائیں تاکہ کفار کو یہ تنبیہ کی جاسکے کہ اگر وہ اسلام کی مخالفت ترک نہیں کریں گے تو ان کی معاشی شہ رگ کاٹ دی جائے گی۔ اس خطرے کے پیشِ نظر اہل مکہ نے مدینے پر حملے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

5- نخلہ کا ناخوشگوار واقعہ

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کفار کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو بھیجا کرتے تھے۔اس قسم کی ایک جماعت عبداللہؓ بن جحش کی قیادت میں نخلہ کی طرف بھیجی گئی۔اس جماعت کو اتفاق سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ مل گیا۔عبداللہؓ نے اس پر حملہ کرکے اس کے سردار عمرو بن الحضرمی کو قتل کر دیا اور دو آدمی گرفتار کر لیے۔جب عبداللہؓ واپس آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں پہنچے تو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس واقعہ پر ناراضگی کا اظہار کیا اور قیدیوں کو ان کے مال واسباب سمیت واپس کر دیا لیکن چونکہ عمرو بن الحضرمی روٴسائے مکہ میں سے تھا اس لیے اہلِ مکہ اس پر سخت برہم ہوئے۔چنانچہ اہلِ مکہ نے انتقامی کارروائی کے طور پر مدینہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور کرز بن جابر فہری نے مدینہ کی ایک چراگاہ پر حملہ کرکے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے جانور لوٹ کر اعلان جنگ کر دیا۔

6- ابوسفیان کا تجارتی قافلہ

اس جنگ کی فوری وجہ یہ ہوئی کہ ابوسفیان کی قیادت میں ایک تجارتی قافلہ مکہ سے شام کی طرف روانہ ہوا تھا۔اس قافلے کی تجارت کا منافع مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے وقف تھا،واپسی پر ابوسفیان کو شک ہوا کہ کہیں مسلمان اس کو لوٹنے کی کوشش نہ کریں چنانچہ اس نے ایک قاصد بھیجا جس نے پیغام اس انداز میں پہنچایا گویا مسلمانوں نے قافلے پر حملہ کر دیا ہے۔اہل مکہ اس خبر کے ملتے ہی فوراً نکل کھڑے ہوئے اور تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں مقام بدر پر خیمہ زن ہو گئے۔

واقعات

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو جب قریش کے حملے کی خبر ہوئی تو صحابہ کرامؓ کو بلا کر مشورہ کیا۔مہاجرین وانصار دونوں نے جاں نثاری کا پیمان باندھا۔حضرت مقدادؓ نے فرمایا''ہم موسیٰ علیہ السّلام کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا خدا جا کر لڑیں۔ہم لوگ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے دائیں سے،بائیں سے،سامنے سے اور پیچھے سے لڑیں گے۔''اس عزمِ صمیم کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایک مختصر سی جماعت جس کی تعداد کم وبیش تین سو تیرہ بیان کی جاتی ہے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔

بدر میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔اگرچہ قریش مکہ کو ابوسفیان کی خیریت کی اطلاع مل چکی تھی تاہم وہ اسلام کے خطرے کا ہمیشہ کے لیے سدباب کر دینا چاہتے تھے نیز عمرو بن الحضرمی کے رشتہ دار خون کا قصاص لیے بغیر ٹلنے والے نہ تھے۔اس جنگ میں کفار کے تین بڑے سردار عتبہ،اس کا بیٹا ولید اور بھائی شیبہ،حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے البتہ عبیدہؓ زخمی ہو گئے جس کے بعد کفار نے بھرپور حملہ کیا اس جنگ میں مسلمان اللہ پر توکل رکھتے ہوئے بے خطر لڑے۔جلد ہی کفار کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان جنگ میں اپنے بڑے بڑے سرداروں شیبہ،عتبہ اور ابوجہل سمیت ستر لاشیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ستر قیدی بھی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔اس طریقے سے حق وباطل کے درمیان اس پہلے مسلح تصادم میں مسلمانوں کو اپنی تعداد وآلاتِ حرب کی کمی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔

اثرات واہمیت

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح اور کفارِ مکہ کی شکست کے اثرات بہت دوررس ثابت ہوئے ۔قریشِ مکہ کے اکثر و بیشتر سردار اس جنگ میں کام آئے اس سے قریش کی قوت بہت کمزور ہوگئی ۔قبائلِ عرب جواب تک قریش کی مثال پرعمل کرتے ہوئے اسلام کی مخالفت کررہے تھے وہ اس واقعے کے بعد مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب ہوگئے اوران کی اسلام دشمنی میں قدرے کمی آ گئی۔جنگِ بدر میں قریش کے تمام بڑے سردار ماسوائے ابوسفیان کے، مارے گئے اس وجہ سے اب ابوسفیان، اہلِ مکہ کا قائد بن گیا۔

اس جنگ سے پیشتر مدینہ کے لوگ یا تو اسلام کے شیدائی تھے یا کھلم کھلا مخالف لیکن مسلمانوں کی فتح نے ایک نیا طبقہ ''منافقین'' پیدا کردیا۔عبداللہ بن ابی اب تک اسلام کا شدید مخالف تھا لیکن جنگِ بدر کے بعد وہ بظاہر ایمان لے آیا۔اس کے ساتھ ہی وہ تمام لوگ جو بادِمخالف کو برداشت نہیں کرسکتے تھے حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئے ۔اس طریقے سے مسلمانوں کے اندر ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جس کی دلی ہمدردیاں اسلام کے ساتھ نہیں بلکہ کفار کے ساتھ تھیں۔

غزوۂ بدر تک یہود میثاقِ مدینہ کی شرائط کو کم سے کم ظاہری طور پر ضرور پورا کرتے تھے۔غزوۂ بدر نے یہ ثابت کردیا کہ اندر سے وہ توحید پرست مسلمانوں کی بجائے مشرکینِ مکہ کے خیر خواہ ہیں ۔ بدر کے مقام پر کفار کی شکست نے یہود کو چوکنا کردیا اور انھوں نے محسوس کیا کہ اگر تھوڑی دیر اور انھوں نے اسلام کو برداشت کیا تو یہ اپنی جاذبیت اور اخلاقی بنیادوں کی وجہ سے اپنی جگہ بنالے گا۔

جنگِ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب

مسلمانوں اور کفار میں سب سے نمایاں فرق یہ تھا کہ مسلمان چونکہ آخرت میں کامیابی کے لیے لڑ رہے تھے اس لیے ان کو موت سے قطعاً خوف نہ تھا بلکہ شہادت ان کی تمنا تھی۔اس کے مقابلے میں قریشِ مکہ خواہ کتنے ہی بہادر کیوں نہ ہوں صرف دنیا کے لیے لڑ رہے تھے اور دنیا پرست آدمی آسانی سے جان دینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔اس کی واضح مثال ابولہب ہے جو اسلام کا شدید مخالف ہونے کے باوجود جنگ میں شریک نہ ہوا، بلکہ اس نے اپنی طرف سے کسی دوسرے شخص کو بھیج دیا تھا جو اس کا مقروض تھا۔میدانِ بدر میں تعداد میں کم ہونے کے باوجود مسلمانوں کی فتح کا سب سے بڑا سبب یہی تھا۔

مسلمانوں کی تنظیم بہترین تھی حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نہایت قابل منتظم تھے، نیز مجاہدین کی ان کے ساتھ وابستگی اور اطاعت نے اسلامی لشکر کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنادیا تھا۔اس کے مقابلے میں قبائلی نظام کے تحت اکٹھی کی گئی ایک فوج تھی جس میں کسی بھی شخص کو مرکزی حیثیت حاصل نہ تھی۔

مسلمانوں کی فتح کی ایک وجہ اسلامی لشکر کے پڑاؤ کے لیے مناسب جگہ کا چناؤ تھا۔ یہ جگہ نسبتاً بلندی کی طرف تھی اس وجہ سے کفارِ مکہ مسلمانوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ کرسکے۔

موسم نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ بارش ہوجانے کی وجہ سے مسلمانوں کی طرف کی اونچی اور ریتلی زمین ان کے لیے بہتر ہوگئی

نیز ان کو استعمال کے لیے پانی میسر آ گیا۔ اس کے برعکس اس بارش نے کفار کی طرف چکنی مٹی کی وجہ سے کیچڑ پیدا کر دی، نیز نشیبی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس طرف جا بجا پانی کھڑا ہو گیا۔ یہ بارش مسلمانوں کے باران رحمت ثابت ہوئی۔

مسلمانوں کی کامیابی کی ایک بہت بڑی وجہ انفرادی مقابلے تھے جو دست بدست لڑائی سے پہلے ہوئے۔ ان سب میں مسلمان مجاہد کامیاب ہوئے۔ عتبہ کے مقابلے پر حضرت حمزہؓ کو، ولید کے مقابلے کے لیے حضرت علیؓ کو اور شیبہ کے مقابلے میں حضرت عبیدہؓ کو بھیجا گیا۔ ان زرہ پوشوں کی آہنی زرہیں انھیں تیغ حق سے بچا نہ سکیں اور حضرت حمزہؓ و حضرت علیؓ نے اپنے حریفوں کو بہت جلد جہنم رسید کیا۔ شیبہ نے البتہ حضرت عبیدہؓ کو زخمی کر دیا لیکن اس دوران میں حضرت علیؓ فارغ ہو چکے تھے، انھوں نے ایک ہی وار سے شیبہ کا کام تمام کر دیا۔ یہ سب کے سب سردارِ قریش مکہ کے مانے ہوئے بہادر تھے، ان کی موت کفار کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے کافی تھی چنانچہ ایک ہزار قریشی لشکر اپنے سے تہائی مسلمان فوج کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔

غزوۂ اُحد (3ھ بمطابق 625ء) کے اسباب

1- کفارِ مکہ کا جذبۂ انتقام

بدر کے میدان میں شکست سے قریش کا وقار سخت مجروح ہوا تھا۔ قریش کو ایک طرح سارے عرب کی سیادت حاصل تھی۔ سب لوگ ان کی شجاعت کا لوہا مانتے تھے لیکن اپنے سے ایک تہائی فاقہ مستوں کے ہاتھوں شکست فاش اتنا برا انجام تھا کہ قریش کا سارا وقار خاک میں مل گیا۔ غزوۂ اُحد دراصل اسی کھوئے ہوئے وقار کے حصول کے لیے لڑی گئی۔

2- مکی شعرا اور خواتین کا پراپیگنڈہ

مکہ میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو مستقلاً نئے معرکے کے لیے زمین ہموار کر رہا تھا۔ عرب میں شعرا کا مقام بہت بلند تھا۔ نشر و اشاعت کے لیے شاعری ایک بہت بڑا ذریعہ تھی اور لوگوں کو جنگ پر ابھارنے میں تو گویا عرب شعرا کو کمال حاصل تھا۔ جنگِ بدر کے بعد عرب شعرا لوگوں میں جذبۂ انتقام پیدا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ قریش کی خواتین نے بھی طعن و تشنیع سے قریشی سرداروں کا ناک میں دم کر دیا اور ان میں سے اکثر خود لشکر کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں۔

واقعات

حضرت عباسؓ نے جو قبول اسلام کے باوجود مکہ ہی میں مقیم تھے قریش مکہ کی جنگی تیاریوں کی اطلاع مدینہ بھجوائی۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے انسؓ و مونسؓ کو بھیج کر کفار کے لشکر کا جائزہ لیا۔ معلوم ہوا کہ ابوسفیان کی قیادت میں تین ہزار کا لشکر مدینہ کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے صحابہ کی مجلسِ مشاورت طلب کی۔ اکابر انصار اور منافقین کے سربراہ عبداللہؓ بن ابی کا مشورہ تھا کہ مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کیا جائے لیکن نوجوان صحابہؓ کی اکثریت مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے حق میں تھی۔ بالآخر کثرتِ رائے سے یہی فیصلہ ہوا اور مسلمان ایک ہزار کی تعداد میں باہر نکلے لیکن عبداللہ بن ابی تین سو منافقین کو لے کر واپس لوٹ

آیا۔ سات سو مومنین کا یہ لشکر اُحد کی پہاڑی کے قریب کفار کے مقابلے میں آیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے 50 تیر اندازوں کا ایک دستہ عبداللہؓ بن جبیر کی قیادت میں پہاڑی پر متعین فرمادیا تا کہ پیچھے سے حملہ نہ ہو سکے۔ انفرادی مقابلوں میں حضرت علیؓ و حمزہؓ اپنے مدِ مقابل پر غالب رہے۔ عام جنگ اس دفعہ بہت شدید تھی۔ ہندہ نے اپنے باپ عتبہ کا بدلہ لینے کے لیے ایک حبشی غلام کے ذریعے حضرت حمزہؓ کو دھوکے سے شہید کروادیا اور ان کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ مسلمانوں کا حملہ اتنا شدید تھا کہ کفار اس کی تاب نہ لا سکے۔ رجز پڑھنے والی عورتیں پیچھے بھاگیں اور ان کے ساتھ ہی فوج بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔

میدان خالی تھا، مسلمانوں نے مالِ غنیمت اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا وہ تیر انداز جن کو حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی طرف سے یہ حکم تھا وہ کسی قیمت پر اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ خالد بن ولید (جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) نے بھانپ لیا کہ مسلمانوں کے عقب پر تیر اندازوں کا پہرہ نہیں رہا۔ چنانچہ اُس نے چند جری نوجوانوں کو لے کر پہاڑی کے عقب سے مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ عبداللہؓ بن جبیر چند تیر اندازوں کے ساتھ اپنی جگہ پر موجود تھے اگرچہ وہ بہادری سے لڑے لیکن اپنے تمام ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔ مومنین جو مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف تھے اس اچانک حملہ کی تاب نہ لا سکے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اسی اثنا میں لشکر اسلام کے علمبردار مصعبؓ بن عمیر جن کی صورت حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے بہت مشابہ تھی شہید ہو گئے ان کی شہادت سے یہ افواہ گرم ہوگئی کہ (**نعوذ باللہ**) محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم شہید ہو گئے ہیں چنانچہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ بایں ہمہ آفتاب رسالت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اپنی پوری تابانی کے ساتھ اپنی جگہ پر چمکتا رہا۔ جان نثار باری باری کر کے راہِ حق میں شہید ہو رہے تھے۔ کفار اپنی پوری کوشش کے باوجود جان نثاروں کا حلقہ نہ توڑ سکے۔ ان حالات میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اُحد پہاڑ کی ایک محفوظ چوٹی پر منتقل ہو گئے۔ القصہ اس غزوہ میں مسلمانوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ابوسفیان نے ہُبل کے تعریفی نعرے بلند کیے۔ فاروق اعظمؓ نے نعرۂ تکبیر سے جواب دیا۔ مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا لیکن کفار میں اتنی جرأت نہ تھی کہ مدینہ پر حملہ کرتے چنانچہ وہ مکہ کی طرف واپس لوٹ گئے۔

جنگِ اُحد کے اثرات

اہل مکہ نے چونکہ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا تھا اس لیے ان کا جوش انتقام ٹھنڈا ہو گیا تھا اور اس کے بعد دو سال تک وہ مسلمانوں کے مقابلے پر نہ آئے۔ اس دوران میں مسلمانوں کو اپنی پوزیشن مضبوط کرنے اور دوسرے دشمنوں کو ختم کرنے کا موقع مل گیا۔

یہود کے حوصلے بلند ہو گئے اور انھوں نے اسلام کی کھلم کھلا شدید مخالفت شروع کر دی، بنونضیر نے تو کھلم کھلا دشمنی کا رویہ اختیار کر لیا چنانچہ اس یہودی قبیلہ کے خلاف کھل کر جہاد کرنا پڑا اور انھیں مدینہ سے نکال دیا گیا۔

اس جنگ کی وجہ سے مسلمانوں کی اخلاقی تربیت پر بہت خوشگوار اثرات مرتب ہوئے اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم سے منہ موڑنے کا نتیجہ انھیں معلوم ہو گیا۔ قرآن پاک نے اس پہلو سے بھی مسلمانوں کی بھرپور تربیت کی۔

اس جنگ میں پہلی مرتبہ منافقین ایک گروہ کی صورت میں سامنے آئے اور اپنے راہنما عبداللہ بن ابی کی قیادت میں جنگ کرنے سے

پہلے لوٹ آئے۔ بعض کمزور مسلمانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اور حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنے ارشادات سے اس ایمانی کمزوری کا علاج کیا۔ ان خصوصی اقدامات کے نتیجہ کے طور پر عام کمزور مسلمان پختہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔

غزوۂ خندق (5ھ بمطابق 627ء)

اسباب

کفر و اسلام کے درمیان جو کش مکش شروع ہوئی تھی تا حال ختم نہیں ہوئی تھی، جنگِ بدر میں کفارِ مکہ شکست کھا چکے تھے۔ جنگِ اُحد میں اگرچہ ان کا پلڑا بھاری رہا تاہم شمع ہدایت کو بجھا نہ سکے تھے۔ اس کے بعد وہ مسلسل قبائل عرب کو اُکسا کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے لیکن اجالا پھیلتا انھوں ہی چلا گیا اور بالآخر انھوں نے ایک دفعہ پھر اسلام پر کاری ضرب لگانے کا ارادہ کر لیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دوسرے قبیلوں کو ساتھ ملانا شروع کر دیا۔

جنگ بدر کے بعد سے قریش شاہراۂ شام سے محروم ہو چکے تھے۔ اُحد میں نقصان اٹھانے کے بعد مسلمان جلد ہی سنبھل گئے اور انھوں نے اپنا اثر و رسوخ نجد اور دومتہ الجندل تک وسیع کر لیا۔ اس طرح سے قریش مکہ کی دوسری تجارتی شاہراہ جو عراق کی طرف جاتی تھی، بھی مسلمانوں کے زیرِ اثر آ گئی۔ قریش مکہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ یا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسلام کی مخالفت ترک کر کے صلح کر لیں یا فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

غزوۂ احد میں نقصان اٹھانے کے بعد مسلمانوں کو عرب قبائل کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا رہا۔ ان بدوی قبائل کا ذریعہ معاش لوٹ مار تھا اور اسلام اپنے حلیف قبائل کو اس کی اجازت نہ دیتا تھا اس لیے ان کی مخالفت بالکل فطری تھی۔ اُحد کے بعد اُن کے حوصلے بلند ہو گئے اور کئی بار انھوں نے مسلمانوں سے الجھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار شکست کھائی۔ یہ بدوی قبائل اس بات کو سمجھتے تھے کہ اسلام کی کامیابی کی صورت میں ایک مضبوط اور منظم حکومت قائم ہو جائے گی اور وہ ڈاکہ اور لوٹ مار کا پیشہ ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں گے نیز مسلمانوں کے ہاتھوں کئی بار شکست کھانے کی وجہ سے وہ انتقامی جذبات بھی رکھتے تھے چنانچہ جونہی یہود اور قریش کی طرف سے مدینہ پر حملہ کی مہم شروع کی گئی وہ فوراً آمادہ ہو گئے۔

جنگِ اُحد کے بعد یہود نے کھلم کھلا مسلمانوں کی مخالفت شروع کر دی تھی چنانچہ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ان کے خلاف مختلف غزوات لڑنے پڑے اور بنوقینقاع اور بنونضیر کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ لوگ خیبر اور شمالی عرب میں آباد ہو گئے۔

واقعات

غزوۂ خندق کے اصل محرک یہود کے سردار حیّ بن اخطب، سلام اور کنانہ تھے۔ وہ قریش مکہ کے پاس پہنچے اور انھیں مدینہ پر بھرپور حملہ کی ترغیب دی۔ مکہ سے جنگ کے لیے چندہ بھی جمع کیا گیا۔ متعدد سردارانِ قریش نے خانہ کعبہ میں جا کر قسم کھائی کہ وہ مرتے دم

تک اسلام کی دشمنی ترک نہ کریں گے چنانچہ نہایت احتیاط کے ساتھ جنگی تیاریاں ہونے لگیں۔ 5ھ میں قریش مکہ، بنوسلیم، یہودی قبائل بنو نضیر اور بنوقینقاع اور ان کے حلیف بنوغطفان، بنوسعد اور بنواسد تقریباً بیس ہزار کی تعداد میں مدینہ پر حملہ آور ہو گئے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ان واقعات کا علم عین موقعہ پر ہوا۔ چنانچہ صحابہ اکرامؓ کی مجلس مشاورت میں یہ طے ہوا کہ اس مرتبہ مقابلہ مدینہ کے اندر رہ کر کیا جائے۔ حضرت سلمانؓ فارسی کے مشورے سے مدینے کی دو سمتوں میں پانچ گز گہری خندق کھودی گئی۔ باقی دو اطراف میں پہاڑی اور مدینہ کے باغات کی دیواریں پہلے ہی موجود تھیں جن کی وجہ سے دشمن اُس طرف سے حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس خندق کو کھودنے کے لیے مسلمانوں نے غیر معمولی صبر وحوصلہ کا ثبوت دیا۔ فاقہ کشی کے عالم میں پیٹ پر پتھر باندھ کر یہ کٹھن کام سرانجام دیا گیا۔ اسی خندق کی کھدائی کے وقت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مسلمانوں کو شام وایران اور یمن کی فتح کی خوشخبری سنائی۔

کفار کا لشکر جب مدینہ پہنچا تو خندق دیکھ کر حیران ہوا اور محاصرہ کر کے بیٹھ گیا اور ہر طرف سے مسلمانوں کی ناکہ بندی کر دی۔ ستائیس دن تک یہ محاصرہ قائم رہا۔ اس دوران متعدد بار خندق کو پار کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔ صرف ایک بار تین کافر خندق پار کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن مسلمانوں نے ان کا کام تمام کر ڈالا۔

مسلمانوں پر اس وقت سخت آزمائش کا وقت تھا۔ ایک طرف رسد کی کمی کی وجہ سے فاقہ پر فاقہ آ رہا تھا دوسری طرف کفار کا لشکرِ عظیم ہر وقت حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا اور شب خون سے بچنے اور خندق کی حفاظت کے لیے دن رات پہرہ دینا پڑتا تھا۔ تیسری طرف خود مدینہ کے اندر دشمن موجود تھے۔ ایک منافقین کا گروہ جو مارِ آستین تھا دوسرا بنوقریظہ کا یہودی قبیلہ جو اگر چہ مسلمانوں کا حلیف تھا لیکن لشکرِ کفار سے ساز باز کیے ہوئے تھا۔ ان حالات میں بنوغطفان کا ایک سلیم الفطرت فرد نعیم بن مسعودؓ مسلمانوں کے کردار وخیالات سے متاثر ہو کر اسلام لے آیا اور اس کی کوششوں سے بنوقریظہ اور قریشِ مکہ کے درمیان بداعتمادی کی فضا پیدا ہو گئی اور مسلمان کم سے کم یہودیوں کے فتنے سے محفوظ رہے۔

ستائیس دن کے محاصرے نے کفار کی ہمتیں پست کر دی تھیں۔ وہ مہم کو جتنا آسان سمجھ کر آئے تھے یہاں انھیں اتنی ہی زیادہ دقت پیش آ رہی تھی۔ ان حالات میں نصرت الٰہی ایک زبردست آندھی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اس طوفان نے کفار کے خیمے اکھاڑ پھینکے اور ان کے چولھوں کی آگ بجھا دی۔ توہم پرست مشرکین نے اس کو بدشگونی خیال کیا اور راتوں رات میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح کفر واسلام کے اس بھرپور تصادم میں فتح وکامرانی حق کے حصے میں آئی۔

اہمیت ونتائج

قریشِ مکہ کی طرف سے یہ مدینہ پر آخری حملہ تھا۔ اس جنگ میں انھوں نے اپنی پوری قوت استعمال کی تھی اس کے باوجود وہ ناکام ہو گئے۔ وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اسلامی حکومت کو ختم کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔

عرب قبائل پر اس غزوہ کی وجہ سے مسلمانوں کی قوت کی دھاک بیٹھ گئی اور ان کی مخالفانہ سرگرمیاں بہت کم ہو گئیں نیز جو قبائل یا افراد اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے ان کے لیے حالات سازگار ہو گئے۔

اس غزوہ میں مسلمانوں کو احساس ہوگیا تھا کہ مدینہ کے اندر یہود کے کسی قبیلے کی موجودگی کیا گل کھلا سکتی ہے، اس لیے بنو قریظہ کی وعدہ خلافی پر سختی سے گرفت کی گئی اور ان کے منہ مانگے ثالث سعد بن معاذؓ نے انھیں یہ سزا سنائی کہ بنو قریظہ کے مرد قتل کر دیے جائیں اور عورتیں اور بچے غلام بنا لیے جائیں۔ اس طریقہ سے مدینہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہودیوں سے پاک ہوگیا۔

اہلِ مکہ پر معاشی دباؤ میں اضافہ ہوگیا۔ ان کے تجارتی راستوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا جس کو ختم کرنے میں وہ ناکام رہے تھے۔ گویا یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ اسلام و کفر کی اس طویل جدوجہد میں بالآخر فتح اسلام کو حاصل ہوگی۔

صلح حدیبیہ (6 ہجری بمطابق 628ء)

جب سے مسلمان ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے نہیں گئے تھے۔ اگرچہ مسلمان قریش مکہ کے مظالم سے مجبور ہو کر اپنا آبائی شہر مکہ چھوڑ کر مدینہ آئے ہوئے تھے لیکن ان کے دل خانہ کعبہ دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ غزوہ خندق کے بعد سنہ 6 ہجری میں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو بشارت ہوئی اس لیے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم چودہ سو صحابہ کرامؓ کے ہمراہ بغرض عمرہ مکہ روانہ ہوئے۔ مسلمانوں کے ساتھ کوئی جنگی ہتھیار نہیں تھے، ماسوائے تلواروں کے اور وہ بھی نیام میں بند تھیں۔ مکہ کے قریب پہنچ کر حدیبیہ کے مقام پر قیام فرمایا۔

قریش مکہ کو جب مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ملی تو کئی سفیروں کو یکے بعد دیگرے روانہ کیا تاکہ مسلمانوں کے آنے کی وجہ معلوم کر سکیں۔ سب نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے ملاقات کرنے کے بعد قریشِ مکہ کو اطلاع دی کہ مسلمانوں کا مقصد صرف زیارت خانہ کعبہ ہے لیکن قریشِ مکہ کسی بھی صورت مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت دینے پر راضی نہیں تھے اس لیے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حضرت عثمان غنیؓ کو سفیر بنا کر قریشِ مکہ کے پاس روانہ کیا۔ قریش مکہ نے حضرت عثمان غنیؓ کو مکہ ہی میں روک لیا۔ اس سے یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان غنیؓ شہید کر دیے گئے۔ اس پر آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور صحابہ کرامؓ سے بیعت لی کہ جب تک حضرت عثمان غنیؓ کے خون کا بدلہ نہیں لیں گے، اس مقام سے نہیں ہٹیں گے۔ اس بیعت کو ''بیعتِ رضوان'' کہتے ہیں۔ قریش مکہ کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت عثمان غنیؓ کو رہا کر دیا۔ اب قریش مکہ نے سہیل بن عمرو کو شرائط صلح طے کرنے کے لیے حدیبیہ روانہ کیا اور مندرجہ ذیل شرائط پر قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان صلح ہوئی جو مقام کی مناسبت سے صلح نامہ حدیبیہ یا معاہدہ حدیبیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

شرائط

1- مسلمان اس سال بغیر عمرہ کیے واپس چلے جائیں گے۔

2- مسلمانوں کو اگلے سال عمرہ کرنے کی اجازت ہوگی لیکن وہ مکہ میں صرف تین دن قیام کریں گے۔

3- مسلمانوں کو اپنے ساتھ ہتھیار لانے کی اجازت نہیں ہوگی، ماسوائے تلوار کے اور وہ بھی نیام میں بند رہیں۔

4- کافروں یا مسلمانوں میں سے اگر کوئی مدینہ بھاگ جائے تو مسلمان انھیں قریش مکہ کے حوالے کر دیں گے لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ آ جائیں تو قریش مکہ انھیں مسلمانوں کو واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔

5- قبائل عرب کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ مسلمانوں اور قریش مکہ میں سے جس کے ساتھ چاہیں شریک ہو سکتے ہیں۔

6- قریش مکہ اور مسلمان آپس میں دس سال تک جنگ نہیں کریں گے۔

یہ معاہدہ حضرت علیؓ نے تحریر کیا۔ صلح حدیبیہ بظاہر دب کر کی گئی تھی اس کے باوجود قرآن نے اس کو ''فتح مبین'' یعنی کھلی ہوئی فتح قرار دیا۔ اگر اس صلح کے نتائج دیکھے جائیں تو اس کی صداقت پوری طرح سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے نتائج مندرجہ ذیل تھے۔

قبول اسلام کے لیے ایک غیر جذباتی اور پر امن فضا نہایت سازگار ثابت ہوتی ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد گویا وہ مسلسل حالت جنگ جس نے پورے عرب کو پریشان کر رکھا تھا وقتی طور پر ختم ہو گئی چنانچہ لوگوں کو ٹھنڈے دل سے تعلیمات اسلامی پر غور کرنے کا موقعہ ملا اور جلد ہی لوگوں پر حق منکشف ہونا شروع ہو گیا۔ اس طرح یہ معاہدہ اسلام کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

چونکہ اس معاہدہ کی رو سے اہل مکہ کو مدینہ جانے کی اجازت تھی اس طرح مکہ میں اسلام کی اشاعت کی رفتار بہت تیز ہو گئی ایک طرف مکی مسلمانوں نے سازگار حالات سے فائدہ اٹھا کر دلائل سے پیغام توحید پہنچایا یا دوسری طرف مدینہ سے آنے والے مسلمانوں نے مدینہ کی اسلامی ریاست کے حالات بتائے۔ حق و باطل کی اس طویل جدوجہد میں اہل حق کے صبر و استقلال، حق پسندی اور اعلیٰ کردار نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید اور فاتح مصر عمروؓ بن العاص جو اب تک قریش کی قیادت کر رہے تھے مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

قریش مکہ کی طرف سے بے فکر ہوتے ہی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے سرزمین عرب سے باہر اسلام کی اشاعت کی طرف توجہ فرمائی چنانچہ کسریٰ ایران اور قیصر روم کو بھی دعوتی خطوط لکھے گئے اگرچہ ان میں سے کسی نے اسلام قبول نہ کیا لیکن قیصر کے دربار میں اسلام کی حقانیت ثابت ہو گئی۔ شاہ حبشہ نجاشی نے فی الحقیقت اسلام قبول کر لیا۔ مقوقش شاہ مصر بھی دعوت اسلامی سے متاثر ہوا۔ عرب کے قبائل سرداروں میں سے منذر بن ساوی حاکم بحرین اور جیفر اور عبد دونوں بھائی جو عمان کے حکمران تھے مشرف بہ اسلام ہوئے نیز انھیں دعوتی خطوط کے نتیجے کے طور پر سرحد شام میں جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے کے طور پر جلد ہی شام فتح ہو گیا۔

بنو نضیر اور بنو قینقاع جو مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد تھے اسلام کے خلاف مسلسل جنگی تیاریاں کر رہے تھے۔ اب تک ان کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ ملا تھا لیکن قریش کی طرف سے سکون حاصل ہوتے ہی حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے خیبر کی طرف توجہ فرمائی اور یہودیوں کا استیصال کیا۔

مختصر یہ کہ یہ صلح بہت سی کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قریش مکہ نے اس صلح نامہ کی رو سے مدینہ کی اسلامی حکومت کو تسلیم کر لیا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ بے سروسامانی کے باوجود صرف اخلاقی قوت کے بل بوتے پر اسلام کی قوت بہت مستحکم ہو گئی۔

صلح حدیبیہ کی شرائط پر مسلمان مضطرب تھے۔ اس کے دو اسباب تھے:

-1 مسلمان عمرہ کرنے کی تمنا لے کر آئے تھے کیونکہ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو خواب میں اس کی بشارت دی گئی تھی لیکن وہ بغیر عمرہ کیے واپس لوٹ رہے تھے۔ مسلمانوں میں اس مسئلہ پر بے چینی تھی، وحی الٰہی میں اس کا جواب یہ تھا۔

''یقیناً اللہ نے اپنے نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا انشاء اللہ تم ضرور مسجدِ حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہوگے اپنے سر منڈاؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمھیں کوئی خوف نہ ہوگا'' یعنی حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا خواب یقیناً پورا ہوگا اور اگلے سال بہتر طریقے سے پورا ہوگا۔

-2 مسلمانوں کو یہ احساس تھا کہ ہمارے نبی برحق ہیں۔ ہم حق پر ہیں اور اللہ نے اپنے دین کو غالب کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

ربِّ کریم نے اس موقع پر سورۃ فتح نازل فرمائی اور اس معاہدہ کو ''فتح مبین'' قرار دیا۔ صرف چند ماہ کے واقعات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ یہ فی الواقعہ مسلمانوں کی کُھلی فتح تھی۔

فتح مکہ (8ھ بمطابق 630ء)

مکہ اسلام کی مخالفت کا مرکز بن چکا تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد بھی اہلیانِ مکہ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے جو اسلامی حکومت کو ختم کرنے کی سوچ رہے تھے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہوگئی کہ جب تک کہ مکہ کفر کے قبضے میں ہے اسلام کی مخالفت ہوتی رہے گی، اس لیے کفر کی قوت کو توڑنے کے لیے اس گڑھ کو توڑنا ناگزیر ہے۔

مکہ کی حیثیت عرب کے سیاسی، سماجی، تجارتی اور مذہبی مرکز تھی۔ اس مرکز پر قبضہ، اسلام کی اشاعت میں نہایت ممد ثابت ہوسکتا ہے تھا۔ عام عرب مکہ اور اسلام کے درمیان کشمکش کے نتیجہ کے منتظر تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ جس کا پلڑا بھاری ہوگا ہم اسی کا ساتھ دیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور حضرت اسماعیل علیہ السّلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر اس لیے کی تھی کہ یہاں خدائے واحد کی عبادت کی جائے لیکن اب خانۂ خدا پر بت پرستوں کا قبضہ تھا۔ سینکڑوں بتوں کی موجودگی میں مسلمانوں کو اس کے گرد طواف کرتے ہوئے طبیعت پر بوجھ محسوس ہوتا تھا اور مشرکین بھی ان کو خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے دیکھ کر کڑھتے تھے۔ چنانچہ مسلمان عمرہ کرنے گئے تو اکثر مشرکین سے دیکھا نہ گیا اور وہ مکہ سے باہر نکل گئے گویا شرک اور توحید کے درمیان یہ مصالحت غیر فطری اور عارضی تھی اس لیے جلد ہی دم توڑ گئی اور مسلمانوں کو فتحِ مکہ کے لیے اقدام کرنا پڑا۔

صلح حدیبیہ کی رُو سے ایسے تمام قبائل کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ مکہ اور مدینہ میں سے جس کے ساتھ چاہیں دوستانہ معاہدہ کر سکتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ معاہدہ کی دفعات کی پابندی کریں اور باہمی جنگ نہ کریں۔ چنانچہ بنوخزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ اور بنوبکر نے قریش کے ساتھ معاہدہ کرلیا تھا۔ بنوبکر اور بنوخزاعہ بہت قدیم دشمن تھے اس لیے بنوبکر سے نہ رہا گیا، انھوں نے بنوخزاعہ کو غافل پا کر ایک

شب ان پر شب خون مارا اور ان کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا۔ یہاں تک کہ بنوخزاعہ کے جن لوگوں نے حرم کعبہ میں پناہ لی تھی عرب کی تمام مذہبی روایات کو پس پشت ڈالتے ہوئے انھیں بھی عین حدودِ حرم میں قتل کیا گیا۔ قریشِ مکہ نے بنوبکر کو روکنے کی بجائے اس کا ساتھ دیا۔ ان میں سے صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابوجہل اور صلح نامہ حدیبیہ کا مصنف سہیل بن عمرو خود بنوخزاعہ پر حملہ کرنے والوں میں شامل تھے۔ یہ گویا صلح حدیبیہ کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ بدیل بن ورقا سردار خزاعہ نے اس کے متعلق حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں شکایت کی اور امداد کی درخواست کی۔ ان کی مدد مسلمانوں پر فرض تھی اس لیے انھوں نے اقدام کا فیصلہ کر لیا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے بدیل بن ورقا کی شکایت پر ایک قاصد مکہ بھیجا اور سرداران قریش سے کہا مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک شرط قبول کر لو:

i- مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے۔

ii- قریش مکہ، بنوبکر کی حمایت ترک کر دیں۔

iii- صلح حدیبیہ کو توڑ دیا جائے۔

جب قاصد مکہ پہنچا تو جواں سال قریشیوں نے جوش میں آ کر کہا کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے۔ گویا صلح حدیبیہ کو توڑنے کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ اکابرینِ قریش اس موقع پر خاموش رہے۔ اسلامی حکومت کے قاصد کے واپس جانے کے بعد سرداران قریش نے محسوس کیا کہ صلح حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کر کے انھوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے چنانچہ انھوں نے ابوسفیان کو مدینہ بھیجا تاکہ وہ معاہدہ کی تجدید کرآئے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس کی درخواست کا کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی سفارش کرنے سے انکار کر دیا لیکن حضرت علیؓ نے از راہِ مذاق اس سے کہا کہ تم بھی تو بنوکنانہ کے سردار ہو مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں کھڑے ہو کر تجدید معاہدہ کا اعلان کر دو۔ چنانچہ ابوسفیان نے ایسا ہی کیا اس پر عام مسلمان مسکرا دیے اور وہ مکہ واپس چلا گیا۔ قریش مکہ نے روداد سنی تو اس کا خوب تمسخر اڑایا اور اسے بتایا کہ حضرت علیؓ نے تمھارے ساتھ مذاق کیا ہے۔ معاہدوں کی تجدید بھلا اس طریقے سے بھی ہوا کرتی ہے؟

واقعات

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قاصد کی واپسی کے فوراً بعد مسلمانوں کو خفیہ طور پر جنگ کی تیاریوں کا حکم دے دیا اور 11 رمضان 8ھ کو دس ہزار کا لشکر تیزی سے مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ مکہ والوں کو اس وقت تک اس لشکر کی اطلاع نہ ہوئی جب تک کہ یہ لشکر مرالظہر ان کی وادی میں جو مکہ سے صرف چار کوس کے فاصلے پر ہے تک پہنچ گیا۔ چرواہوں کے ذریعے رات کو سرداران قریش کو اس لشکر کی آمد کی اطلاع ہوئی تو ابوسفیان یہ سن کر بہت گھبرایا اور بے اختیار پوچھنے لگا کہ اب کیا کیا جائے؟ حضرت عباسؓ جو اپنی قوم کے قبولِ اسلام کے لیے بے قرار تھے، کہا کہ میرے پیچھے بیٹھ جاؤ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے پاس چلتے ہیں، وہیں سے تمھیں امان مل سکے گی۔ حضرت عمرؓ راستے میں ملے، ابوسفیان کو قتل کرنا چاہا اور دربارِ رسالت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تک اور ابوسفیان کا پیچھا کیا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حضرت عباسؓ کی سفارش پر ابوسفیان کی جان بخشی کر دی اور ایک رات کے غور و فکر کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔

صبح دس ہزار کا یہ عظیم لشکر الٰہی مکہ میں داخل ہوا لیکن عام رواج کے برعکس یہ لشکر قتل وغارت نہیں کر رہا تھا بلکہ عام اعلان تھا کہ ہر اس شخص کو امان دی جاتی ہے جو:

i- ہتھیار پھینک دے۔ ii- خانہ کعبہ کے اندر پناہ لے لے۔

iii- اپنے گھر کے دروازے بند کر لے۔ iv- ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے۔

صرف خالدؓ بن ولید کے دستے کے خلاف کچھ جوشیلے قریشیوں نے مدافعت کی جس میں دو مسلمان شہید اور تیرہ کفار قتل ہوئے۔ اس کے بعد آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حضرت علیؓ کے ساتھ مل کر کعبہ کو بتوں سے پاک کیا۔ حضرت عمرؓ نے دیواروں کی تصویریں مٹائیں اور اس طریقہ سے بیت اللہ کو کفر وشرک کی آلائشوں سے پاک کر کے وہاں نماز شکرانہ ادا کی گئی۔ اس کے بعد حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قریش کے سامنے مندرجہ ذیل خطبہ دیا۔

''خدائے واحد کے سوا کوئی اور معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اس نے اپنے عاجز بندے کی مدد کی اور تمام مخالف گروہوں کا زور توڑ دیا۔ کسی شخص کے لیے جو خدا اور رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر ایمان لایا ہے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مکہ میں خونریزی کرے۔ کسی سرسبز درخت کا کاٹنا بھی اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ زمانۂ جاہلیت کی تمام رسمیں اور فخر میرے پاؤں کے نیچے ہیں مگر مجاورتِ کعبہ اور حاجیوں کو آبِ زمزم پلانے کا انتظام باقی رکھا جائے گا۔ اے گروہِ قریش! اللہ نے تمھیں جاہلیت کے تکبر اور آباؤ اجداد پر فخر کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ تمام آدمی آدم علیہ السّلام سے اور آدم علیہ السّلام مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''لوگو میں نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھارے قبیلے اور خاندان بنا دیے تاکہ تم ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ لیکن خدا کے نزدیک بہتر وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو، خدا علیم وخبیر ہے۔ اے گروہِ قریش تم کو معلوم ہے کہ تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟''

سردارانِ قریش نے سر جھکا لیے اور کہا ''آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔''

نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا ''میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف علیہ السّلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب لوگ چھوڑ دیے گئے ہو۔''

اس خطبہ کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے کوہِ صفا پر بیٹھ کر لوگوں سے خدا اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اطاعت کی بیعت لی۔

فتح مکہ کی اہمیت

مکہ پر اسلامی قبضہ دراصل ایک بہت بڑا انقلاب تھا جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ قریش کے اسلام قبول کرنے کے بعد سارے عرب کے لوگوں نے جوق در جوق اسلام قبول کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ اسی انتظار میں تھے کہ اس کشمکش کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا حقانیت کی یہ سب سے بڑی دلیل تھی کہ اس کے مخالفین نے خود اس کو سچا مان لیا۔ قریشِ مکہ کے قبولِ اسلام نے عربوں کو اسلام

کے پرچم تلے متحد کر دیا۔ صرف بنوثقیف و بنوہوازن نے مزاحمت کی۔ باقی سبھی قبائل مطیع وفرمان ہوتے چلے گئے۔ عرب کی یہ متحدہ اسلامی ملت اب پوری دنیا کے سامنے داعی اسلام کی حیثیت سے آ گئی جس نے اگلے پچیس تیس برسوں میں دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ قریش عرب کے قائد تھے، وہ بہادر تھے، بلا کا حافظہ رکھتے تھے، اچھے سیاستدان اور اچھے منتظم تھے۔ جلد ہی ان کی یہ ساری صلاحیتیں اس وقت کی مہذب دنیا کو اسلام کے پرچم تلے لانے میں استعمال ہوئیں۔

خطبہ حجۃ الوداع

جب اسلام سارے عرب میں پھیل گیا حق و باطل کی طویل کش مکش میں حق غالب آ گیا اور باطل سرنگوں ہو گیا تو اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کی تنظیم مکمل ہوئی اور صلحا کی ایک جماعت دنیا کی امامت کے لیے تیار ہو گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورۂ نصر نازل فرمائی جس میں لوگوں کے قبولِ اسلام اور نصرت الٰہی کے شکرانے کے طور پر نماز پڑھنے اور قربانی دینے کی ترغیب دلائی گئی تھی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے محسوس کیا کہ اس سورہ کے نزول کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ لہٰذا جلد ہی بلاوا آنے والا ہے چنانچہ حج ادا کرنے کا ارادہ کیا تاکہ حج کے عظیم اجتماع میں مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور ساری دنیا کے لیے بالعموم اسلام کے بنیادی اصولوں کا اعلان کر دیا جائے جو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بعد دنیا کی رہنمائی کا کام دیں۔ ایک انبوہ کثیر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوا۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر احرام باندھا گیا اور کوہ و دشت ''لبیک لبیک'' کی آواز سے گونج اٹھے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مکہ کے قریب قیام فرمایا، کعبہ کا طواف کیا اور مقامِ ابراہیمؑ میں دوگانہ نماز ادا کی۔

9 ذوالحجہ کو نمازِ فجر کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میدان عرفات میں تشریف لے گئے اور اونٹنی پر سوار ہو کر وہ مشہور خطبہ دیا جو ''خطبہ حجۃ الوداع'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ خطبہ تمام اسلامی تعلیمات کا لُبِ لباب ہے۔ خطبہ کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد اور توحید و رسالت کی شہادت سے کیا اور اپنے وصال کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا ''لوگو میری باتیں غور سے سنو مجھے کچھ پتہ نہیں کہ اس سال کے بعد میں اس مقام پر آپ سے کبھی ملاقات کر سکوں یا نہ کر سکوں''۔ اس کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جو ہدایات فرمائیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

''اللہ کے بندو میں تمھیں اللہ سے ڈرنے کی تاکید کرتا ہوں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا'' جاہلیت کے تمام دستور آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں'' لوگو بے شک تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ بھی ایک، عربی کو عجمی اور عجمی کو عربی پر، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت حاصل نہیں امتیاز صرف تقویٰ کی بنا پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آبا وَ اجداد پر فخر کو مٹا دیا ہے۔ تم سب کے سب آدم علیہ السّلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنے تھے۔''

''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ زمانہ جاہلیت کے تمام خون اور انتقام باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون معاف کرتا ہوں۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے تاکید فرمائی اگر کسی کے پاس امانت ہو تو وہ اسے ادا کرے، سود موقوف کر دیا گیا، ہاں تمھیں سرمایہ مل جائے گا۔ سب سے پہلے میں عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔ لوگو! تمھاری اس سرزمین میں شیطان اپنے پوجے جانے سے مایوس ہو گیا ہے لیکن چھوٹے گناہوں میں اپنی اطاعت

سے خوش ہے اس لیے اپنے دین کو اس سے محفوظ رکھو۔''

''تمھارے غلام تمھارے ہیں جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔ عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو، تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تمھارا خون، مال اور تمھاری آبرو قیامت تک اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن، اس مہینہ میں اور یہ مہینہ سال میں محترم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اب کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے۔ مجرم اپنے جرم کا خود ذمہ دار ہے۔ باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور بیٹے کے جرم کے لیے باپ جوابدہ نہیں ہے۔ اگر ناک کٹا حبشی بھی تمھارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق حکم دے تو اس کی اطاعت کرو۔ عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرے، قرض ادا کیا جائے۔ میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں اگر تم انھیں تھامے رکھو گے تو تم کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ دو چیزیں ''قرآن اور میری سنت'' ہیں۔ اپنے پروردگار کی عبادت کرو، نماز پنجگانہ کو قائم رکھو۔ ایک ماہ کے روزے رکھو اور میرے احکام کی اطاعت کرو تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''

یہ ارشاد فرمانے کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے لوگوں سے تین بار سوال کیا کہ جب خدا قیامت کے روز تم سے پوچھے گا کہ رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے تم تک پیغام پہنچایا یا نہیں تو کیا جواب دو گے؟ سب نے بیک زبان جواب دیا کہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ اس کے بعد آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اوپر آسمان کی طرف انگلی کر کے فرمایا ''یا اللہ گواہ رہنا اور اپنے خطبے کا اختتام اس ہدایت پر کیا کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ تمام ہدایات دوسروں تک پہنچا دیں۔

اہمیت

خطبہ حجۃ الوداع دینی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب اللہ، سنتِ رسُول اللہ اور احکامِ الٰہی کی اہمیت واضح فرمائی گئی ہے۔ فرد کے حقوق، انفرادی جائیداد کا تحفظ اور انسانی جان کا احترام سکھایا گیا ہے۔ سود کی لعنت پر آخری ضرب لگائی گئی ہے۔ عرب کی جاہلی لڑائیوں کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔ عورت کے حقوق کا تعین کیا گیا ہے۔ غلاموں کو وہ مقام دیا گیا ہے جو تاریخ انسانی میں نہ کبھی انھیں حاصل ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

خطبہ حجۃ الوداع انسانی مساوات اور اسلامی اخوت کے اصولوں پر صالح معاشرے کی تعمیر کا سنگِ بنیاد ہے۔ الغرض یہ خطبہ اسلامی حکومت کے منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خطبہ کے ارشاد کے بعد اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کا اعلان فرما دیا اور آیت نازل فرمائی تھی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

ترجمہ : آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

مشقی سوالات

-1 درج ذیل سوالات کے جواب دیں۔

-i آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی مکی زندگی کے مختصر حالات بیان کریں۔

-ii اعلانِ نبوت کے بعد آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو قریشِ مکہ کی طرف سے کس قسم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا؟

-iii ہجرت مدینہ کے اسباب وواقعات تحریر کریں۔

-iv غزوۂ بدر کے اسباب، واقعات اور نتائج پر روشنی ڈالیں۔

-v تاریخ اسلام میں غزوہ احد کی اہمیت بیان کریں۔

-vi غزوۂ خندق کے اسباب، واقعات اور نتائج کی اہمیت بیان کریں۔

-vii صلح حدیبیہ سے کیا مراد ہے؟ نیز اس کی شرائط اور نتائج پر روشنی ڈالیں۔

-viii فتح مکہ کے اسباب اور نتائج بیان کریں۔

-ix آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کے خطبہ حجۃ الوداع کے اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی پہلوؤں کا جائزہ لیں۔

-2 مختصر جواب دیں۔

-i آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی پیدائش کہاں ہوئی؟

-ii کیا آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی پیدائش کے وقت آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کے والد ماجد زندہ تھے؟

-iii عام الفیل سے کیا مراد ہے؟

-iv آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی دایہ کا نام لکھیں۔ان کا تعلق کس قبیلہ سے تھا؟

-v پچیس سال کی عمر میں آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی شادی کن کے ساتھ ہوئی؟

-vi آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کے دادا کے علاوہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی کفالت کس نے کی؟

-vii آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم جس غار میں جا کر عبادت کرتے تھے اس کا نام کیا تھا؟

-viii حلف الفضول سے کیا مراد ہے؟

-ix اللہ کا پیغام لے کر کون سا فرشتہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کے پاس آتا تھا؟

-x حجر اسود کی تنصیب کا مسئلہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم نے کس طرح حل فرمایا؟

-xi شعب ابی طالب میں آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کتنے برس رہے؟

-xii جنگ بدر میں لشکر کفار کی تعداد کتنی تھی؟

xiii- ہجرت مدینہ کے دوران نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قبا میں کتنے دن قیام کیا؟

xiv- حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جس غلام کو حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ تجارتی سفر پر بھیجا اس کا نام بتائے۔

xv- رسول کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے کون سے چچا جنگ احد میں شہید ہوئے؟

3- **خالی جگہ پُر کریں۔**

i- حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے چچا زاد بھائی............نے بچوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔

ii- غزوۂ احد سن............میں لڑی گئی۔

iii- ابوجہل جنگ............میں مارا گیا۔

vi- اسلام کے پہلے مؤذن کا نام............تھا۔

v- میثاق مدینہ کو اسلامی دور کا............کہا جاتا ہے۔

vi- میثاق مدینہ کا اسلامی دور کا............تھا۔

vii- صلح نامہ حدیبیہ مسلمانوں اور............کہا جاتا ہے۔

viii- جنگ خندق............ھ میں لڑی گئی۔

ix- مدینہ میں یہودیوں کے............بڑے قبیلے تھے۔

x- غزوۂ خیبر............ھ میں ہوئی۔

4- **مندرجہ ذیل سوالات میں درست پر (✓) اور غلط پر (×) کا نشان لگائیں۔**

i- ابوجہل اسلام دشمن تھا۔

ii- مکہ کے لوگوں کی برائیاں دیکھ کر آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پریشان ہوتے تھے۔

iii- مردوں میں سب سے پہلے حضرت حمزہؓ نے اسلام قبول کیا۔

iv- حضرت جعفر طیارؓ نے حبشہ کے بادشاہ کے سامنے تقریر کی۔

v- اسلام کی پہلی مسجد ''مسجد قبا'' تھی۔

باب 3

سیرتِ نبوی صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم
(مختلف پہلو)

انسانِ کامل

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کے اخلاق حسنہ کے بیان کے لیے اگر تمام کائنات صفحات اور تمام سمندر سیاہی میں تبدیل ہوجائیں تب بھی شاید ممکن نہ ہو۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم مکہ کے ایک اونچے گھرانے قریش سے متعلق تھے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی شادی مکہ کی نہایت مالدار خاتون حضرت خدیجہؓ سے ہوئی۔ مدنی دور میں مالِ غنیمت کے انبار آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کے سامنے لگائے جاتے رہے لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم دنیاوی مال ومتاع سے بے نیاز تھے۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کی اپنی زندگی نہایت سادہ رہی ساری عمر کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا۔ عرب کے اس حاکم اعلیٰ کا اپنا بستر ایک بوریا تھا جس کو آرام کی خاطر کبھی کبھار دوہرا کرلیا جاتا۔ دلوں کی اقلیم پر حکمران ہونے کے باوجود کبھی ذاتی ضروریات کے لیے کسی سے قرضہ نہ مانگا باوجود اس کے کہ ایک ایک ماہ تک آپ کے چولھے میں آگ نہ جلتی۔ ان حالات میں صرف چند کھجوروں اور پانی پر گزر رہوتی۔ جو کا اَن چھنا آٹا وہ نعمت کبیرہ تھی جو حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو فراخی کے ایام میں میسّر آتی تھی۔ طبیعت نہایت سادہ تھی۔ بہت بڑی سلطنت کے منتظم اعلیٰ ہونے کے باوجود شان وشوکت نام کو نہیں تھی۔ اپنے ہاتھ سے اپنی بکری کا دودھ دوہتے، اپنے جوتے گانٹھتے اور اپنے کپڑوں کو پیوند لگاتے۔ مہمات میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کام کرتے۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں خود اینٹیں اٹھاتے رہے۔ غزوۂ خندق میں اپنے حصے کی خندق خود کھودی بلکہ جہاں کہیں کوئی پتھر ایسا آیا جس کو اکھاڑنا صحابہؓ کے بس میں نہ تھا تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو بلایا گیا۔ الغرض ظاہر وباطن کا شہنشاہ خود فقیری کی زندگی بسر کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں طائف کا سفر خاص طور پر قابل ذکر ہے جہاں سردارانِ بنو ثقیف نے غلاموں اور اوباشوں کے ذریعے آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم پر اتنے پتھر برسائے کہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم لہولہان ہوگئے۔ حضرت زیدؓ بن حارث نے اس وقت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم سے اہل طائف کے لیے دعائے ہلاکت کرنے کو کہا لیکن حضور صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم نے ان کے حق میں ہدایت کی دعا فرمائی۔

آپ صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم نے اپنی عقل وبصیرت کی بدولت بہت سے پیچیدہ مسائل باآسانی سلجھا دیے مثلاً تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کو نصب کرنے کا جھگڑا اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کا فیصلہ جس سے سب مطمئن ہوگئے۔ میثاق مدینہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی

ذہانت کا ایک نمونہ ہے کہ کس طرح مدینہ کے تمام باشندوں کو بلا امتیازِ مذہب وملت اسلامی حکومت کا شہری بنایا گیا اور اس طریقہ سے خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی قیادت میں ایک دستوری معاشرہ وجود میں آیا۔

صلح نامہ حدیبیہ تو وہ دستاویز ہے جس کو اس وقت سمجھنے سے فاروق اعظمؓ بھی قاصر رہے تھے لیکن بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ جو دستاویز بظاہر یک طرفہ نظر آ رہی تھی دراصل ''فتح مبین'' تھی۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا فرمان ہے کہ مجھے مکارم اخلاق کے لیے معبوث کیا گیا ہے۔آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حسن سلوک میں جو مثال پیش کی ہے تاریخ اس کی تمثیل لانے سے قاصر ہے۔آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہر ضرورت مند آدمی کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتے،بیکسوں کا سہارا بنتے یتیموں کی پرورش گویا آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا فریضہ تھا اور مریضوں کی عیادت آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا شعار۔ان صفات عالیہ کے ساتھ ساتھ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خوش خلقی بھی بے مثال تھی۔صحابہ کرامؓ کے ساتھ نفیس ولطیف قسم کے مذاق بھی کرتے تھے مثلاً ایک بار آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے کسی کو ایک اونٹ دینے کا وعدہ فرمایا اور صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اس کو ایک اونٹنی کا بچہ دے دو۔جب اس شخص نے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو وعدہ یاد دلا کر نہایت اضطراب کے ساتھ مطالبہ کیا کہ اس کو اونٹ دیا جائے نہ کہ اونٹنی کا بچہ تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس سے دریافت کیا'' کہ کیا اونٹ اونٹنی کا بچہ نہیں ہوتا؟''

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے کوہ احد کے برابر سونا بھی مل جائے تو میں اسے راہِ خدا میں خیرات کر دوں۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی سائل نے سوال کیا ہو اور استطاعت رکھنے کے باوجود آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسے پورا نہ کیا ہو۔آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے پاس جب کبھی مال غنیمت آتا تو جب تک آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اسے تقسیم نہ کر لیتے نیند نہ آتی۔غرض ساری عمر جو ہاتھ آیا اپنی بجائے حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے پر صرف کر دیا۔آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے تمام قرضے دوسروں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے حاصل کیے اور بعد میں خود ادا فرمائے۔

حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اخلاقِ کاملہ کا پہلو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا عدل وانصاف ہے۔ایک حاکم کی حیثیت سے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حکومت میں رشوت وسفارش نہیں چلتی تھی اور نہ ہی تعصب کام کرتا تھا۔ایک دفعہ ایک مسلمان (جو فی الحقیقت منافق تھا) اور یہودی کا تنازعہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سامنے پیش ہوا،آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے یہودی کو حق پر پایا اور بے دھڑک فیصلہ یہودی کے حق میں دیا۔

فتح مکہ کے بعد بنومخزوم کی ایک عورت فاطمہ بنت الاسد چوری کے جرم میں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سامنے پیش کی گئی۔قریش نے اسامہؓ بن زید کے ذریعے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سامنے اس کی سفارش کی۔آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا بخدا اگر فاطمہؓ بنت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بھی چوری کرتی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیا جاتا۔آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے عدل کے سامنے امیر وغریب،معزز وغیر معزز،قریشی اور غیر قریشی سب برابر تھے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زندگی توازن کا عملی نمونہ تھی،آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اپنی عادات میں اعتدال تھا۔

نہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بہت تیز چلتے کہ رفتار باوقار نہ رہے نہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اتنے سست رفتار تھے کہ دیکھنے والے یہ محسوس کریں کہ چلنے والے کو وقت کی قیمت کا احساس نہیں ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے نہ بات کو غیر ضروری طوالت دیتے تھے کہ سننے والے تھک جائیں اور نہ بات اتنی مختصر کرتے کہ غیر واضح اور ادھوری رہ جائے۔ بالعموم عفو و درگزر کے عادی تھے لیکن جہاں اصلاح کے لیے سختی کی ضرورت ہوتی تھی وہاں سختی بھی کرتے تھے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے عرب معاشرے کو سرتاپا بدل کر رکھ دیا۔ اس کی ایک ایک قدر بدل گئی اور بالکل نیا ڈھانچہ تیار ہوا جس کی بنیاد کفر و شرک کی بجائے توحیدِ الٰہی پر، جنگ و انتشار کی بجائے اتحاد و اتفاق پر، ظلم و زیادتی کی بجائے عدل و تحفظ پر رکھی گئی تھی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے تمام اخلاقی برائیوں کا سدِ باب کیا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے عورت کے حقوق متعین فرمائے۔ اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا۔ چار سے زیادہ شادیاں ممنوع قرار دیں اور ان کے درمیان عدل قائم رکھنا مرد کی ذمہ داری قرار دی گئی بصورت دیگر ایک ہی عورت پر اکتفا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ پردے کے احکام جاری فرمائے تاکہ عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت ہو سکے۔ عورت کو وراثت میں حصہ دار بنایا گیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے عورت کے حقوق کی تصریح فرمائی اور ان کے تحفظ کی تاکید فرمائی۔

عرب کی معاشرتی زندگی میں ایک واضح انقلاب قبائلی نظام میں اصلاح تھی۔ عرب میں قبائلی تفاخر بالعموم باہمی جنگ و جدل کا باعث بنتا تھا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے آباپرستی اور قبائلی تفاخر کو ختم کیا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے بالکل مختلف بنیادوں پر ایک نئی ملت کی تشکیل فرمائی جو بذاتِ خود ان کے انسانِ کامل ہونے کی واضح دلیل ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بطور منتظم اعلیٰ

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، وہ جہاں عبادت کے طریقے بتاتا ہے، اللہ اور اس کے بندے کے درمیان تعلق قائم کرتا ہے اور اعمال صالح اور عبادات کی تلقین کرتا ہے وہاں اجتماعی زندگی کے متعلق بھی اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتا ہے۔ اس کا اپنا ایک الگ سیاسی، اقتصادی اور عدالتی نظام ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس نظام کو عملاً قائم فرمایا۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں اسلامی حکومت کی بنیادیں جن پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے نظام حکومت کی تشکیل کی تھی۔ اس نظام حکومت کے خدوخال میں سب سے نمایاں اسلام میں خداوند کریم کی الوہیت کا تصوصلّیر تھا۔ اس میں یہ بات شامل ہے کہ پوری کائنات کا حاکمِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کا حکم یہ حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے سامنے بغیر کسی حیل و حجت کے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ چونکہ یہ کائنات پیدا اس نے کی ہے اس لیے حکومت بھی اسی کی ہونی چاہیے۔

خدا کے بعد اسلامی حکومت میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ خدا اپنے تمام احکام

رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہی کے ذریعے لوگوں تک پہنچا تا ہے۔ نیز رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان احکام کی عملی صورت لوگوں کو بتائیں چنانچہ سورۃ نساء میں ارشادِ الٰہی ہے۔

''خدا کی قسم یہ لوگ اس وقت تک ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی تنازعات میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم کو نہ مان لیں اور اس کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں بلکہ اس فیصلے کے خلاف ان کے دل میں ملال بھی پیدا نہیں ہونا چاہیے۔''

گویا اسلامی حکومت میں حاکمیت خدا کو اور اس کے بعد کل اختیارات رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو حاصل ہیں۔ اسلام ایک جمہوری نظام ہے جس میں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم صحابہ کرامؓ کے مشوروں سے معاملات کا فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔ کبار صحابہؓ سے بالعموم ہر مسئلہ پر مشورہ لیا جاتا تھا لیکن اہم معاملات کو تمام صحابہ کی مشاورت سے مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں طے کیا جاتا تھا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بطور سپہ سالار صلّی

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی لیکن تمام مسلمان مجاہد تھے اس لیے گویا پوری امت مسلمہ اسلامی فوج تھی۔ اس فوج کے سربراہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم خود ہوتے تھے۔ اہم غزوات میں خود ہی فوج کو ترتیب دیتے اور خود ہی اس کی کمان کرتے لیکن بعض اوقات خود شریک جنگ نہ ہوتے اور کسی صحابی کو امیر العسکر بنا کر بھیج دیتے، مثلاً جنگ موتہ میں لشکر اسلامی کے یکے بعد دیگرے تین سربراہ مقرر کیے گئے۔

مجاہدین کو مستقل تنخواہیں نہیں ملتی تھیں بلکہ قرآن کے احکامات کے تحت مالِ غنیمت کا $\frac{4}{5}$ حصہ مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا۔ پیدل کو ایک حصہ اور سوار کو دو حصے ملتے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے میدان جنگ میں خاص مہارت کا ثبوت دیا۔ پہلے تیراندازی اور نیزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے دشمن کی فوج کے بالکل قریب آنا اور پھر یکبارگی حملہ کر دینا اتنی کامیاب جنگی چال تھی کہ اس جنگی طریقہ نے اکثر و بیشتر کفار کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح غزوہ احزاب میں حضرت سلمانؓ فارسی کے مشورے کے مطابق خندق کا استعمال ابوسفیان و دیگر حملہ آوروں کے لیے حیران کن تھا۔ منجنیق اور دبابہ کا استعمال بھی حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ غزوہ موتہ میں خالدؓ بن ولید نے فوج کو دستوں میں تقسیم کر کے حملہ کرنے کا آغاز کیا جسے بعد میں مزید ترقی دی گئی۔

سربراہِ اعلیٰ

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں کتابت وحی کے لیے بعض صحابہ اکرمؓ کو مقرر کیا گیا تھا۔ ان میں حضرت زید بن ثابتؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخری زمانے میں امیر معاویہؓ کو بھی کاتبِ وحی مقرر کیا گیا تھا۔ یوں کبھی کبھار یہ کام حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور ابی بن کعبؓ کے حصے میں بھی آیا۔ اس شعبے کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ وہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی طرف سے مختلف احکام اور مبلغین کے نام فرامین لکھیں۔ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی مہر مبارک حضرت حنظلہؓ بن ربیع کے پاس رہتی تھی۔ یہ مہر ان فرامین پر ثبت

کی جاتی تھی۔جس طرح کتابت کے لیے کوئی الگ دفتر مقرر نہ تھا لیکن ایک شعبہ موجود تھا جس میں مختلف صحابہ اکرمؓ وقتاً فوقتاً اس کام کو سرانجام دیتے تھے اس طرح مختلف شعبوں کا کھاتہ بھی رکھا جاتا تھا اور تقسیم کار کے اصول پر مختلف شعبوں کا کھاتہ رکھنا مختلف صحابہ کرامؓ کے ذمہ تھا۔ زکوٰۃ وصدقات کا حساب حضرت زبیرؓ بن عوام رکھتے لوگوں کے درمیان باہمی لین دین کا حساب وکتاب مغیرہؓ بن شعبہ کے پاس تھا جبکہ مال غنیمت کا حساب ایک اور صحابی کے ذمہ تھا۔بحالی امن واحتساب کے شعبے ابھی باقاعدہ طور پر قائم نہیں ہوئے تھے تاہم اس سلسلے میں حسب ضرورت بندو بست موجود تھا۔قیسؓ بن سعد مدینہ میں بحالی امن وامان کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔احتساب کا کام حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم خود سرانجام دیا کرتے۔آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بازار میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کے اوزان وغیرہ کی پڑتال فرماتے اور اگر کوئی خرابی دیکھتے تو انسداد فرماتے ،مثلاً ایک بار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے گندم کے ایک انبار کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو نیچے کی گندم کو بھیگی ہوئی پایا۔دکاندار کو سرزنش فرمائی اور فرمایا کہ بھیگی ہوئی گندم کو اوپر رکھو تا کہ لوگ اسے دیکھ لیں اور''جو دھوکا دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

عدل وانصاف

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اسلامی ریاست عدلیہ کے سربراہ تھے،مدینہ کے تنازعات اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ خود فرماتے تھے لیکن عدلیہ کا کام اتنا محدود نہ تھا کہ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم خود ہی اسے سرانجام دے دیتے۔افتا یعنی تشریح کا قانون اسلامی کی ذمہ داری معزز صحابہ کرامؓ پر بھی تھی۔اس طرح مدینہ کے علاوہ دوسرے علاقوں میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم قاضی مقرر کرکے بھیجا کرتے تھے۔مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تنازعہ کی صورت میں فیصلہ اسلامی قانون ہی کے مطابق کیا جاتا تھا۔

نظامِ معیشت پر کنٹرول

اسلامی نظامِ معیشت کو بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے عملاً قائم کرکے دکھایا۔پوری اسلامی حکومت میں سود ممنوع تھا،اسی طرح سٹہ اور جوا پر بھی پابندی تھی،حرام چیزوں کی تجارت بھی حرام تھی۔

مال غنیمت کا $\frac{4}{5}$ حصہ مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا لیکن $\frac{1}{5}$ حصہ حکومت کے مصارف، یتامیٰ اور مساکین کے لیے وقف تھا،وہ سرکاری خزانے میں جمع ہوتا تھا جو بالعموم آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم فوراً ہی حق داروں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

ہر مسلمان پر زکوٰۃ فرض تھی۔یہ زکوٰۃ نقد روپیہ،مویشی (جن میں جنگی گھوڑے شامل نہیں تھے)اور مال تجارت پر 2.5 فیصد سالانہ کے حساب سے وصول کی جاتی تھی۔دوسو درہم چاندی 20 مثقال سونے اور پانچ اونٹوں سے کم پر زکوٰۃ واجب نہ تھی۔زکوٰۃ بالعموم جہاں سے اکٹھی کی جاتی تھی وہیں کے مستحقین میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔اس میں سے زکوٰۃ وصول کرنے والوں کی تنخواہیں بھی ادا ہوتی تھیں۔

مسلمانوں کی زمینوں پر حکومت کے ٹیکس کو عشر کہتے تھے۔یہ بارانی زمینوں پر دس فیصد اور سیراب کردہ زمینوں پر پانچ فیصد ہوتا تھا کیونکہ زمین کو سیراب کرنے کے لیے الگ محنت اور اخراجات کرنے پڑتے تھے۔

لوگوں کوصدقات دینے کی ترغیب دی جاتی تھی ۔ یہ صدقات آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں پیش کیے جاتے جو انھیں مستحقین میں تقسیم فرماتے یا اصحاب صفہ کی خدمت میں پیش کیے جاتے جو انھیں مستحقین میں تقسیم فرماتے (اصحاب صفہ یعنی وہ لوگ جو حصول علم کے لیے مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں مقیم رہتے تھے)۔

مفتوحہ غیر مسلم قوموں کے ساتھ معاہدہ کی رو سے ان کی پیداوار کا ایک حصہ خراج کے طور پر وصول کیا جاتا تھا جو مجاہدین میں تقسیم ہوتا تھا۔ اہل وعیال والا مجاہد دو حصوں اور مجرد ایک حصے کا حقدار سمجھا جاتا تھا۔

غیر مسلم رعایا سے اس کی حفاظت کے عوض ایک ٹیکس لیا جاتا تھا جس کی مقدار ایک دینار فی عاقل بالغ مرد سالانہ تھی ۔ اس مد سے وصول کردہ رقم بھی مجاہدین کا حق شمار ہوتی تھی اور خراج کے ساتھ ہی ان میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

محاصل وصول کرنے کی ذمہ داری بالعموم قبیلے کے سردار پر ہوتی تھی لیکن بعض اوقات مدینہ سے معاشی قوانین کے جاننے والے صحابہ کرامؓ کو بھی بھیجا جاتا تھا۔ حق سے زیادہ لینے اور مال چھانٹ کر لینے کی اجازت نہ تھی اور اس سلسلے میں ہر ظلم کا ازالہ کیا جاتا تھا۔ محصول وصول کنندگان کو عطیات اور تحفے لینے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔

مشقی سوالات

1- معمارِ قوم کی حیثیت سے رسول کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے کارنامے بیان کریں۔
2- بطور معاشرتی مصلح نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی شخصیت کا جائزہ لیں۔
3- حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم انسان کامل تھے۔ وضاحت کریں۔
4- بطور منتظم سلطنت حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے کارناموں پر روشنی ڈالیں۔

باب 4

خلافتِ راشدہ

خلافتِ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(11ھ تا 13ھ بمطابق 632ء تا 634ء)

عہدِ نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدماتِ اسلام

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تعلق بنوتمیم سے تھا۔ اس خاندان کو مکہ کی شہری ریاست میں دیت وقصاص کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ مردوں میں سے سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے صحابی تھے۔ آپؓ کے قبولِ اسلام کے بعد اسلام فی الواقعہ ایک تحریک بن گیا کیونکہ آپؓ نے قریشِ مکہ کے کئی جید صحابیوں کو اسلام کے پرچم تلے جمع کیا۔ جب کوئی شخص اسلام قبول کرنا چاہتا تو بالعموم حضرت ابوبکرؓ ہی سے رابطہ قائم کرتا۔ اس طرح آپؓ کو پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے نمائندے کی حیثیت حاصل تھی۔ آپؓ کی ایک اہم خدمت یہ ہے کہ آپؓ نے ان مظلوم مسلمانوں کی قیمت ادا کر کے انھیں آزادی دلوائی جن پر ان کے کافر آقا ظلم ڈھا رہے تھے۔ ان میں حضرت بلالؓ، عامرؓ بن فہرہ، زنیرہؓ اور نہدیہؓ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے تمام صحابہ کرامؓ کو ہجرت کی اجازت دے دی اور آخر میں خود ہجرت کا فیصلہ فرمایا اور اپنے ساتھ سفر کے لیے اپنے جاں نثار ابوبکرؓ صدیق کو منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس ہمراہی کو سراہا ہے۔

مدینے میں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسلامی مرکز بنانے کے لیے مسجدِ نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تعمیر کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے وہی جگہ منتخب کی جہاں آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اونٹنی قصویٰ خود بخود بیٹھ گئی تھی۔ اس جگہ کو خریدنے کے لیے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ارشاد کے مطابق اس کی قیمت حضرت ابوبکرؓ نے ادا فرمائی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کفار کے خلاف مسلح تصادم کے تمام مراحل میں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ رہے۔ غزوہ بدر میں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے دفاع کی ذمہ داری آپؓ پر تھی۔ غزوۂ احد کے مشکل ترین لمحات میں آپؓ کا ساتھ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو میسر تھا۔ غزوۂ بدر کے بعد قیدیوں کی رہائی کے بارے میں فیصلہ آپؓ ہی کی رائے کے مطابق کیا گیا۔ غزوۂ خندق میں بھی آپؓ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے معاونِ خصوصی تھے۔ یہود مدینہ کے خلاف کارروائیوں کے علاوہ صلح حدیبیہ میں بھی آپؓ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مشیرِ خاص تھے۔ فتح مکہ میں بھی حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ ساتھ رہے اور آزمائش کی ہر گھڑی میں ثابت قدم رہے۔ غزوہ تبوک کے

موقعہ پر گھر کی ہر چیز خدمتِ اقدس میں پیش کردی اور جان و مال کے ایثار کا حق ادا کر دیا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حجتہ الوداع سے پہلے حضرت ابوبکرؓ ہی کو امیر حج مقرر کر کے روانہ کیا تھا اور آپؓ ہی کو سورۃ توبہ کی تنبیہ اور فیصلہ کن احکام عوام کو سنانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنے آخری ایام میں مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی امامت آپؓ ہی کو سونپی۔

خلافت

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وفات کے بعد ابھی اُن کی تجہیز و تکفین بھی نہ ہو پائی تھی کہ خلافت کا مسئلہ ابھر کر سامنے آیا۔ چونکہ یہ مسئلہ نہایت اہم تھا اگر اس سلسلے میں امتِ مسلمہ میں کوئی اختلاف پیدا ہو جاتا تو امت کا شیرازہ رحلتِ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے فوراً بعد ہی بکھر جاتا۔ اس لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور ابوعبیدہؓ بن الجراح کو ساتھ لے کر فوراً وہاں پہنچے۔ انصار کی خلافت کو عام قبائل عرب تسلیم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ قریش کا احترام مدتوں سے ان کے دل و دماغ میں گھر کر چکا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں سے کہا کہ یہ عمرؓ اور ابوعبیدہؓ دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کرلو۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر فرمایا کہ ''آپؓ ہم سب سے بہتر اور رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سب سے زیادہ مقرب ہیں لہٰذا ہم آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ حضرت صدیقؓ کی شخصیت سب کے لیے محترم تھی۔ اس طرح مسلمانوں نے کثرت رائے سے آپؓ کو اپنا پہلا خلیفہ چنا۔

بیعتِ انصار کے بعد آپؓ مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں تشریف لائے اور دیگر مسلمانوں نے بھی آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد آپؓ نے ایک نہایت اہم تقریر کی جو ہر دور کے مسلمانوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ آپؓ نے فرمایا:

''میں آپ لوگوں پر حکمران بنایا گیا ہوں حالانکہ میں آپ میں سے سب سے بہتر انسان نہیں ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے یہ منصب اپنی رغبت اور خواہش سے نہیں لیا ہے اور نہ میں یہ چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کی بجائے یہ مجھے ملے۔ میں نے اس لیے قبول کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں میں اختلاف اور عرب میں فتنہ ارتداد برپا ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ میرے لیے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے بلکہ یہ ایک بارِ عظیم ہے جو مجھ پر ڈال دیا گیا ہے، جس کے اٹھانے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔ ماسوائے اس کے اللہ میری مدد فرمائے۔ اب بھی اگر آپ لوگ مجھے دیگر اصحاب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے معیار پر جانچیں گے اور مجھ سے وہ توقعات رکھیں گے جو حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے آپ رکھتے تھے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ وہ شیطان سے محفوظ تھے اور ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر میں ٹھیک کام کروں گا تو میری مدد کیجیے اور غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجیے۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمھارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلوادوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جہاد چھوڑ دے اگر اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کردے اگر میں اللہ اور رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔ میں پیروی کرنے والا ہوں نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشکلات

1- فتنۂ ارتداد

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے وصال کے ساتھ ہی نومسلم بدوعرب دین سے منحرف ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اسلامی حکومت کی سیاسی قوت سے مرعوب ہو کر اسلام قبول کیا تھا اور وہ دین کو ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھے تھے۔ بت پرستی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے وصال کے بعد بظاہر اسلامی حکومت میں وہ مضبوطی نہ رہی تھی اس لیے انھوں نے دوبارہ اپنے پرانے معبودوں کی پرستش شروع کر دی۔

2- مدعیانِ نبوت

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم یتیم پیدا ہوئے تھے لیکن نبوت کی وجہ سے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو پورے عرب کے تاجدار کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور مومنین کا ایک مضبوط گروہ پیدا ہو گیا جو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر جان چھڑکتا تھا۔ بعض حقیقت ناشناس لوگوں نے سوچا کہ نبوت کی دعوت قوت حاصل کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔ چنانچہ سرزمین عرب میں جگہ جگہ جھوٹے پیغمبروں کا ظہور ہونا شروع ہو گیا۔ مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، طلیحہ بن خویلد تین مردوں کے علاوہ ایک عورت سجاح نے بھی دعویٰ پیغمبری کر دیا۔ ان جھوٹے مدعیان نبوت کا استیصال ضروری تھا ورنہ ناپختہ مسلمانوں کے گمراہ ہو جانے کے پورے امکانات تھے۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ قبائلی تعصب ابھی پوری طرح سے ختم نہ ہوا تھا اور لوگ یہ کہتے تھے کہ ہمارا جھوٹا نبی قریش کے سچے نبی سے بہتر ہے۔

3- منکرینِ زکوٰۃ

عرب کسی حکومت کو ٹیکس دینا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ مدتوں سے وہ بالکل آزاد چلے آرہے تھے اور ان سے کبھی کسی نے ٹیکس وصول نہ کیا تھا۔ اسلامی حکومت نے اس کے برعکس ان سے زکوٰۃ اور عشر وصول کرنے شروع کر دیے۔ اگرچہ یہ جمع شدہ ٹیکس انھیں کے غربا و مساکین میں تقسیم ہو جاتا تھا لیکن انھیں یہ بات گوارا نہ تھی کہ کوئی ان سے ٹیکس کا مطالبہ کرے۔ یہ لوگ دین کی تمام باتوں پر ایمان رکھتے تھے لیکن زکوٰۃ ادا کرنے سے انکاری تھے۔

4- لشکرِ اُسامہؓ کی روانگی کا مسئلہ

بنوغسان کے ساتھ تصادم آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ جنگِ موتہ میں عیسائی مسلمانوں کی قوت کا اندازہ کر چکے تھے۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ کس طرح مٹھی بھر مسلمان پوری عیسائی فوج کو شکست دے سکتے ہیں۔ جنگ تبوک میں انھیں اسی لیے مقابلے پر آنے کی ہمت نہ تھی لیکن اس کے باوجود بنوغسان کی پشت پر سلطنت روم کی پوری قوت تھی اس وجہ سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی باز آ جائیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے آخری ایام میں انھوں نے اسلامی حکومت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی

تھی اوراس کے سدِ باب کے لیے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسامہؓ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر بھی تیار فرمایا تھا لیکن آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی رحلت کی وجہ سے وہ لشکر رک گیا تھا۔ آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وفات کی خبر عیسائیوں کے لیے اور بھی زیادہ حوصلہ افزا تھی اس لیے عیسائی قوتوں کی طرف سے شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقدامات

پہلے خلیفہ کے طور پر حضرت ابوبکرؓ نے اسلامی حکومت کو مندرجہ بالا خطرات سے بچانے کے لیے سب سے پہلے اسامہ بن زیدؓ کا لشکر روانہ فرمایا۔ منکرینِ زکوٰۃ اور مرتدین کی بغاوتوں کی وجہ سے اکثر صحابہ اکرامؓ کی رائے یہ تھی کہ اسامہؓ کے لشکر کو روانہ نہ کیا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر مدینہ میں اتنا سناٹا ہو جائے کہ درندے آکر میرے ٹانگیں نوچیں تب بھی میں اس مہم کو جس کی روانگی کا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حکم دیا تھا نہیں روک سکتا۔''

یہ جواب حضرت ابوبکرؓ کے ارشادِ نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر عمل کرنے کے عزمِ مصمم کا آئینہ دار تھا۔ اس سے یہ اصول منطبق ہوتا ہے کہ محض نامساعد حالات کی بنا پر خدا اور رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے احکام کو پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔

حضرت ابوبکرؓ کا یہ لشکر کامیاب و کامران واپس لوٹا۔ بظاہر حالات نہایت تشویشناک تھے لیکن لشکر کی روانگی کے نہایت خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ اہلِ شام مقابلے پر نہ آئے اور عرب قبائل جو مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو رہے تھے اس لیے رک گئے کہ اس قوت کی تسخیر جو سلطنت روم کا مقابلہ کرنے چلی ہو اتنی آسان نہیں ہے۔ اس طرح سے مسلمانوں کو تمام مشکلات پر یکے بعد دیگرے قابو پانے کا موقع مل گیا اور وقتی طور پر عیسائیوں کی مخالفت دب گئی۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے واضح طور پر اعلان فرما دیا تھا کہ وہ آخری نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں اور ان کے بعد کسی نبی کی آمد متوقع نہیں لیکن دعویٰ نبوت کو ایک نفع بخش کاروبار سمجھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے اپنی پیغمبری کا اعلان کر دیا۔ اسامہؓ کے لشکر کی واپسی کے بعد آپؓ نے ان کذابوں کی طرف توجہ فرمائی۔

طلیحہ بن خویلد اسدی کے خلاف خالدؓ بن ولید کی قیادت میں فوج بھیجی گئی۔ عدی بن حاتم طائی نے بنو طے کو طلیحہ کی حمایت سے الگ کر لیا۔ باقی ماندہ فوج کو خالدؓ بن ولید کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ طلیحہ خود شام بھاگ گیا جہاں چند سال بعد اس نے تجدید اسلام کر لی اور مدینہ واپس چلا آیا۔

مسیلمہ کذاب کے خلاف آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے شرحبیلؓ بن حسنہ اور عکرمہؓ بن ابوجہل کو بھیجا، عکرمہؓ بن ابوجہل نے بنو حنیفہ پر قبل از وقت حملہ کر دیا اور شکست کھائی۔ حضرت ابوبکرؓ کو جب اس شکست کی خبر پہنچی تو انھوں نے خالدؓ بن ولید کو اس مہم پر متعین فرمایا۔ اسی دوران سجاح بنت حارث جو عورت ہونے کے باوجود مدعی نبوت تھی وہ بھی مسیلمہ سے جا ملی اور اس نے مسیلمہ کے ساتھ شادی کر لی۔ خالدؓ بن

ولید نے ان دونوں کی متحدہ فوجوں کو شکست دی۔ مسیلمہ میدان جنگ ہی میں قتل ہوا اور سجاح بھاگ کھڑی ہوئی۔ اسود عنسی کی اپنی جماعت میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی جماعت کے ایک فرد فیروز نے اس کو قتل کر دیا، اس طرح مدعیان نبوت کا استیصال ہو گیا۔

کچھ قبائلی شیوخ محض خودسری کی وجہ سے مرتد ہو گئے تھے۔ مدعیانِ نبوت کے بعد ان کی باری آئی۔ نعمان بن منذر کے مقابلے کے لیے علاؓ بن الحضرمی کو بحرین بھیجا گیا، حدیفہ لقیط بن مالک کا مقابلہ کرنے کے لیے عمان روانہ ہوئے اور زیادؓ کو کندہ کے علاقہ کے باغیوں کے استیصال پر مامور فرمایا گیا۔ تینوں مہمات اپنے مقاصد میں کامیاب رہیں، لقیط بن مالک قتل ہوا اور باقی باغیوں نے اطاعت قبول کر لی۔

منکرین زکوٰۃ کے مسئلہ میں بھی اس طرح اختلاف رائے تھا۔ جیسے لشکر اسامہؓ کو بھیجنے کے بارے میں تھا بعض کبار صحابہ کرامؓ کا خیال تھا کہ یہ لوگ کلمہ گو مسلمان ہیں لیکن صرف زکوٰۃ سے منکر ہیں۔ ان پر تلوار نہیں اٹھائی جاسکتی۔ حضرت ابوبکرؓ کی دینی بصیرت نے یہاں بھی نہایت صحیح فیصلہ دیا۔ آپؓ نے فرمایا:

''خدا کی قسم جو شخص رسول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی میں بکری کا ایک بچہ بھی زکوٰۃ میں دیتا تھا اگر وہ اسے دینے سے انکار کرے گا تو میں اس کے مقابلے میں جہاد کروں گا۔''

حضرت ابوبکرؓ نے تمام منکرین زکوٰۃ کے خلاف فوجیں روانہ فرمائیں اور بنوعبس اور بنوذبیان کے خلاف خود گئے۔ اس طریقہ سے منکرین زکوٰۃ کا بھی سدباب ہو گیا۔

ایران کے ساتھ تصادم

عرب ایک بے آب و گیاہ علاقہ تھا۔ اس کے مقابلے میں ایران کے لوگ متمول اور مادی اعتبار سے مضبوط تھے۔ اس لیے اہلِ ایران عربوں کو ہمیشہ اپنے سے حقیر تر سمجھتے تھے۔ انھوں نے بار بار یہ کوشش بھی کی کہ وہ عرب قبائل پر قابض ہو جائیں لیکن ہر دفعہ ان کے واپس جانے کے بعد عربوں نے اپنی آزادی دوبارہ حاصل کر لی۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے تمام حکومتوں اور شیوخ عرب کو دعوتی خطوط لکھے تھے۔ خسرو پرویز شاہِ ایران نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا نامۂ مبارک پھاڑ کر سفیر کی توہین کی اور اپنے گورنر کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی گرفتاری کا حکم دیا، اس واقعے نے مسلمانوں کے اندر جذبہ انتقام پیدا کر دیا تھا۔

اسلام نے قبائل عرب کو متحد کر کے ایک مضبوط قوت بنا دیا تھا۔ ایرانیوں کو عربوں کا یہ استحکام پسند نہ تھا کیونکہ قدیم چپقلش کی وجہ سے وہ اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے نیز عرب کو وہ اپنا غلام سمجھتے تھے اور یہ مضبوطی گویا غلام علاقے کی بغاوت کے مترادف تھی۔

حیرہ کی عرب ریاست نے جو ایران حکومت کے ماتحت تھی، فتنۂ ارتداد میں باغی قبائل کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی ہر طرح سے امداد کی۔ یہ گویا اسلامی حکومت کے خلاف دشمنی کا اظہار تھا جس کا انتقام لینا ضروری تھا۔

عراق میں بعض قبائل عرب جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ ہمیشہ سے ایرانی حکومت کے ظلم کا شکار رہے تھے۔ جنگ کی فوری وجہ انھیں عرب قبائل کے ایک سردار مثنیٰؓ بن حارثہ کی امداد کی درخواست تھی۔

فتوحاتِ عراق

مثنیٰؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے امداد کی درخواست کی چنانچہ آپؓ نے حضرت خالدؓ کو مثنیٰؓ کی اعانت پر مامور فرمایا۔ عراق پہنچ کر خالدؓ نے گورنر عراق کو لکھا کہ ''اسلام قبول کرو یا جزیہ دو ورنہ تمھیں ایک ایسی قوم سے لڑنا پڑے گا جو موت کی اتنی ہی خواہش رکھتی ہے جتنی تم زندگی کی تمنا رکھتے ہو۔'' ہرمز نے جنگ کی راہ اختیار کی۔ لڑائی میں ایرانیوں کو شکست ہوئی اور ہرمز مارا گیا۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید حیرہ کی طرف بڑھے۔ حاکم شہر نے اپنے لڑکے کی قیادت میں کچھ فوج مسلمانوں کو راستے میں روکنے کے لیے بھیجی۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے اس فوج کو شکست دی۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید شمالی عراق کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے انبار کا محاصرہ کیا گیا تیراندازی کے شدید مقابلے کے بعد اس شہر پر قبضہ ہوگیا۔

عین التمر کے مقام پر مسلمانوں کو تازہ دم ایرانی فوج اور عرب قبائل کی متحدہ فوج سے مقابلہ کرنا پڑا۔ مسلمانوں نے دونوں کو شکست دی۔

دومتہ الجندل کے عیسائی سردار اکیدر بن عبدالملک نے بدعہدی کرتے ہوئے بغاوت کردی۔ دربارِ خلافت سے عیاضؓ بن غنم کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ اکیدر نے بنوغسان سے بھی مدد مانگی۔ چنانچہ خالدؓ بن ولید کو عیاضؓ کی امداد کے لیے جانا پڑا۔ خالدؓ بن ولید کے پہنچتے ہی اکیدر نے ہتھیار ڈال دیے اور عیاضؓ نے جبلہ کو شکست فاش دی اس طرح دومتہ الجندل کی بغاوت کا خاتمہ ہوگیا۔

فراض کے مقام پر ایران و روم کی سرحدیں آپس میں ملتی تھیں اس لیے جب مسلمانوں نے فراض کی طرف پیش قدمی کی تو ایرانیوں اور رومیوں نے تمام باہمی اختلافات کو مٹا کر مسلمانوں کے خلاف اتحاد کرکے ایک کثیر لشکر لے کر دریائے فرات عبور کیا اور لشکر اسلام پر حملہ کردیا۔ لیکن شکست ہوئی۔ عقب میں دریا ہونے کی وجہ سے پسپائی کا راستہ بھی نہ ملا اور تقریباً تمام فوج مقتول ہوئی۔

قدیم تاریخی شہر بابل کے قریب مثنیٰؓ کی فوج اور تازہ دم ایرانی فوج ایک دوسرے کے مدمقابل آئیں۔ ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوگیا۔

شام کے ساتھ تصادم کی وجوہات

شام درحقیقت سلطنت روم کا ایک صوبہ تھا۔ رومی حکومت مذہبی وجوہات کی بنا پر عربوں کے ساتھ زمانہ قدیم سے ہی مخالفت رکھتی تھی۔ ابرہہ گورنر یمن نے حبشہ کے بادشاہ کے حکم سے خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کی کوشش کی تھی وہ شہنشاہِ روم کے اشارے پر کی گئی تھی۔

فتوحاتِ شام

صدیق اکبرؓ نے فتح شام کے لیے چار لشکر تیار کیے۔ دمشق پر حملہ کرنے کے بعد یزیدؓ بن ابوسفیان، حمص پر ابوعبیدہؓ بن الجراح، اردن پر شرحبیلؓ بن حسنہ اور فلسطین پر عمروؓ بن العاص مقرر ہوئے۔ ہرقل شام حمص میں مقیم تھا۔ انھوں نے ملک کے طول وعرض میں اپنی فوجیں پھیلا دیں۔ ابوعبیدہؓ کو کمک کی ضرورت محسوس ہوئی لہٰذا خالدؓ بن ولید کو عراق سے شام جانے کا حکم دیا گیا۔ خالدؓ بن ولید نے شام پہنچتے ہی بصرہ کے غسانیوں پر حملہ کیا اور انھیں شکست دی انھوں نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔

مسلمانوں کی فوج چار حصوں میں تقسیم تھی لیکن شام پہنچ کر انھوں نے محسوس کیا کہ الگ الگ رہ کر رومیوں کا مقابلہ کرنا خاصہ مشکل ہوگا۔ چنانچہ وہ اجنادین کے مقام پر اکٹھے ہو گئے خالدؓ بن ولید بھی یہیں ان سے آ ملے۔ ہرقل نے بھی مسلمانوں کے اجتماع کی خبر پا کر تمام فوجوں کو اجنادین ہی میں جمع کر لیا۔ اس کے لشکر کا سربراہ اس کا بھائی تھا۔ خود ہرقل اس کے لیے مزید کمک کا بندوبست کرنے میں مصروف تھا۔ مسلمانوں کے سربراہ حضرت خالدؓ بن ولید تھے۔ دونوں لشکر کافی دن تک ایک دوسرے کے سامنے پڑاؤ ڈالے رہے۔

ایک دن حضرت خالدؓ کو اطلاع ملی کہ صبح رومی حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنے لشکر کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستے کو اپنے ساتھ رکھا۔ صبح سب سے پہلے چالیس ہزار رومیوں نے حملہ کیا لیکن حضرت خالدؓ نے اپنے دستے کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور انھیں میدان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ایک دوسرا لشکر جرجہ بن زید رومی کی قیادت میں بڑھا۔ جرجہ کے دل میں اسلام گھر کر چکا تھا۔ اس نے حضرت خالدؓ کو بلایا اور ان سے اسلام کے متعلق چند سوالات کیے۔ اس کے بعد وہ لشکر کو چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ آ ملا اور اسی جنگ میں رومیوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا۔ جرجہ کے قبولِ اسلام کے بعد رومیوں نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ مسلمان مجاہدین بہت بہادری سے لڑ رہے تھے لیکن لشکر کفار اور مسلمانوں کا کوئی تناسب نہ تھا۔ عکرمہ نے بلند آواز سے پکارا کون ہے جو میرے ہاتھ پر موت کے لیے بیعت کرتا ہے۔ آناً فاناً چار سو جان نثارانِ حق نے موت کی بیعت کی اور لشکر کفار پر ٹوٹ پڑے۔ شام تک یہی سماں رہا۔ رومی فوجیں تھک ہار چکی تھیں انھوں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے تعاقب نہ چھوڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ ساری رات جاری رہی اور صبح تک کفر و باطل کے بادل چھٹ چکے تھے۔ رومیوں کی ایک کثیر تعداد مقتول ہوئی اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔

اس فتح کے بعد مسلمانوں نے شام کے کافی حصہ پر قبضہ کر لیا اور دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے وقت اسلامی لشکر دمشق کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت

حضرت محمد مصطفی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم فرمایا کرتے تھے ”جن لوگوں نے بھی ہم پر کوئی احسان کیا ہم نے اس کا بدلہ دے دیا سوائے ابوبکرؓ کے۔ ان کا ہم پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا بدلہ خدا قیامت کے دن دے گا“ حضرت عمر فاروقؓ کی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں یہ رائے تھی ”حضرت ابوبکرؓ ہم سب میں بزرگ تھے، ہم سب سے بہتر تھے اور رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی نگاہ میں ہم سب سے زیادہ عزیز

تھے۔''

حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے رفیق اور عمر بھر کے ساتھی تھے۔ جوانی میں تجارتی سفر اکٹھے کیا۔ سلامتی طبع کے سبب حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے قلبی دوست تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اعلائے کلمۃ الحق کی ذمہ داری سونپی تو حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنے گھر والوں کے بعد یہ بات سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ ہی کے سامنے رکھی جنھوں نے بلا تامل اسلام قبول کیا اور منصبِ رسالت کی ذمہ داریوں میں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ساتھ دینے کا یقین دلایا۔ اس عہد کو آپؓ نے عمر بھر نبھایا اور احسن طریقے سے پورا کیا۔ اسی وجہ سے آپؓ کو انبیاء کے بعد افضل ترین انسان ہونے کا شرف حاصل ہے۔

حضرت محمد مصطفی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ جس طرح آسمان کے تارے شمار کرنا مشکل ہے اسی طرح ابوبکرؓ کی نیکیاں بھی ان گنت ہیں۔ کامیاب تاجر تھے لیکن رزقِ حرام کا لقمہ نہیں کھایا۔ ایک مرتبہ ایک غلام کی کمائی میں سے کچھ کھا لیا جب پتہ چلا تو انگلی ڈال کر قے کر دی تاکہ لقمہ حرام پیٹ میں نہ رہے۔ رات کو اللہ کے حضور کھڑے ہوتے، صبح خوش الحانی سے قرآن کی تلاوت فرماتے، کثرت سے روزے رکھتے نماز کی حالت میں اتنا روتے کہ ڈاڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ حالتِ نماز میں یوں ساکن ہوتے جیسے کوئی سوکھی ہوئی لکڑی کھڑی ہو۔ کوئی دوست، رشتہ دار، تعلق دار آپؓ کو اللہ کی اطاعت کی حدود سے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ حق و انصاف کی بات کرتے اور ہمیشہ حق کا ساتھ دیتے۔

صدیق اکبرؓ ذاتی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی بلند ترین انسانوں میں سے تھے۔ نہایت سنجیدہ، دور اندیش، مستقل مزاج، عزم کے راسخ اور با تدبیر۔ غرض انسانی عظمت کے لیے درکار تمام اوصاف آپؓ میں موجود تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دین کا فہم بدرجہ کمال حاصل تھا۔ منکرین زکوۃ کے خلاف جہاد کا فیصلہ قیامت تک کے مسلمانوں پر آپؓ کا گراں قدر احسان ہے۔

صحابہ کرامؓ کے اصرار پر بیت المال میں سے بقدر ضرورت وظیفہ مقرر کروایا تو وصیت کی کہ میرا مکان بیچ کر جو رقم میں نے اب تک بیت المال سے لی ہے واپس کر دی جائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سیرت کا اہم ترین پہلو محمد مصطفی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ والہانہ عقیدت ہے۔ مکہ کا دور ابتلا ہو یا زمانۂ خلافت، عشقِ رسول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہمیشہ آپ کا راہنما رہا۔

زندگی بھر آپ نے کوئی ایسا اقدام نہ کیا جو حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو ناپسند ہو۔ کوئی نئی راہ نہیں نکالی، شریعت سے کوئی انحراف برداشت نہیں کیا، کسی دشمن رسول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو معاف نہیں کیا، کسی برائی کے ساتھ مصالحت نہیں کی، دنیا کا کوئی فرعون آپؓ کو مرعوب نہ کر سکا اور کوئی مشیت آپؓ کو سنتِ نبوی سے ہٹنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ آپؓ کی عظمتِ کردار کا بنیادی سبب حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ آپؓ کی والہانہ محبت اور یہ عزمِ صمیم تھا کہ وہ اپنے محبوب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی راہ پر نہایت وفاداری کے ساتھ جمے رہے۔

مشقی سوالات

-1 **درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات تحریر کریں۔**

-i عرب میں فتنہ ارتداد کے رونما ہونے کی وجوہات لکھیں نیز حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس فتنہ کو ختم کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے؟

-ii خلافت سنبھالتے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو مشکلات پیش آئیں وہ کیا تھیں آپؓ نے ان مشکلات پر کیسے قابو پایا؟

-iii حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سیرت و کردار پر ایک جامع نوٹ تحریر کریں۔

-2 **مندرجہ ذیل کے مختصر جواب تحریر کریں:**

-i منکرین زکوٰۃ کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا کہا تھا؟

-ii نبوت کا دعویٰ کرنے والی عورت سجاح نے کس کے ساتھ شادی کی؟

-iii غزوہ بدر کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسیران بدر کے متعلق کیا فیصلہ کیا تھا؟

-iv قبل از اسلام حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خاندان کو مکہ میں کیا اختیار حاصل تھا؟

-v حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو غلام آزاد کروائے ان میں سے دو کے نام لکھیں۔

-vi حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خطبہ خلافت میں سے دو نکات لکھیں۔

-vii اہل عرب میں سے کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟

-viii ہجرت کے وقت آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ شریکِ سفر کون تھا؟

-3 **مناسب الفاظ کے ساتھ خالی جگہ پر کریں:**

-i مردوں میں سب سے پہلے.................... نے اسلام قبول کیا۔

-ii حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وفات کے ساتھ ہی.................... اسلام سے منحرف ہو گئے۔

-iii عرب کسی حکومت کو.................... دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

-iv خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے.................... کا لشکر روانہ کیا۔

-v جھوٹے نبی طلیحہ بن خویلد اسدی کی سرکوبی کے لیے.................... کی قیادت میں لشکر بھیجا گیا۔

-vi یمن میں.................... نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔

-vii حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فتح شام کے لیے.................... عساکر تیار کیے۔

-viii حضرت ابوبکر صدیقؓ حالت نماز میں اس طرح کھڑے ہوتے جیسے....................۔

-ix منکرین زکوٰۃ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے.................... کے مقام پر شکست دی۔

-x قبل از اسلام حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خاندان کو مکہ میں.................... کا اختیار حاصل تھا۔

خلافت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاروق اعظم

(13ھ تا23ھ بمطابق634ء تا644ء)

حضرت عمرؓ بن خطاب کا تعلق بنو عدی کے ساتھ تھا۔ آپؓ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت پر حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ملتا ہے۔ بنو عدی کو قریش کی طرف سے سفارت اور ثالثی کے شعبے سونپے گئے تھے۔ عمرؓ بن خطاب قریش کے ان سترہ سرداروں میں سے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ بچپن میں فنون سپہ گری کی تعلیم بھی پائی تھی اور عکاظ کے میلے میں کُشتی کے مقابلوں میں بھی شریک ہوئے۔

آپؓ مزاجاً سخت گیر ہونے کے سبب اپنے خاندان کی لونڈی لبینہؓ کی اسلام قبول کرنے کی وجہ سے سخت پٹائی کرتے تھے لیکن وہ بھی اسلام ترک کرنے کو تیار نہ تھی۔ حضرت عمرؓ اس کی استقامت سے دل ہی دل میں سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ آخر کون سا جذبہ ہے جو اس لونڈی کو اتنی جرأت اور استقامت دے رہا ہے۔

ایک روز فیصلہ کیا کہ آبائی دین کو بچانے کے لیے (نعوذ باللہ) محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا فیصلہ کر دیا جائے۔ تلوار لے کر دوڑتے ہوئے بازار سے گزرے تو ایک مسلمان نعیمؓ بن عبداللہ (جس نے اپنے قبول اسلام کا اعلان عام نہیں کیا تھا) نے راستے میں روک کر پوچھا۔ حضرت عمرؓ کہاں کا ارادہ ہے؟ جب حضرت عمرؓ نے اپنا ارادہ بتایا تو انھوں نے کہا ''پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو تمھاری بہن فاطمہؓ اور تمھارے بہنوئی سعیدؓ بن زید بھی اپنا دین ترک کر چکے ہیں۔'' عمرؓ نے غضبناک ہو کر ان کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں پہنچے تو انھیں قرآن پاک پڑھتے پایا تو ان پر تشدّد شروع کر دیا۔ بہنوئی کو مارنے کے لیے زمین پر گرا کر ان کے سینے پر چڑھ گئے۔ بہن نے چھڑوانے کی کوشش کی تو اس کو بھی زخمی کر دیا۔ بہن نے اسی حالت میں روتے ہوئے کہا عمرؓ جو تمھارا دل چاہے کر لو اب ہم اسلام ترک کرنے والے نہیں ہیں۔ اس پختگی ایمان کا حضرت عمرؓ پر اچھا اثر ہوا اور کہا مجھے بھی وہ کتاب دکھاؤ جو تم پڑھ رہے تھے۔ بہن نے کہا تم ناپاک ہو۔ پہلے وضو کرو۔ آپؓ نے وضو کیا اور قرآن پاک کی تلاوت کی۔ قرآن کی آیات نے ان کے دل کی دنیا بدل ڈالی اور وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

قبول اسلام کے بعد آپؓ کے ایما پر حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور صحابہ کرامؓ خانہ کعبہ گئے اور سرعام نماز ادا کی۔ آپؓ کی انھی صلاحیتوں کے سبب حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم خود دعا فرمایا کرتے تھے کہ یا اللہ عمرؓ بن خطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے کسی کو اسلام کی توفیق دے دے تاکہ اسلام کو تقویت حاصل ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت اور عہدِ نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم میں خدماتِ اسلام

حضرت عمرؓ بن خطاب ان بہادروں میں سے تھے جن کی شجاعت کا سکہ مکہ میں مانا جاتا تھا اس لیے آپؓ کے اسلام قبول کرنے سے قریش مکہ پر اسلام کا رعب طاری ہو گیا۔ تاہم آپؓ کو بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

قبولِ اسلام کے بعد خانہ کعبہ گئے اور سرعام دو رکعت نماز پڑھی اور وہاں بیٹھے ہوئے سردارانِ قریش سے کہا ''جس کو آج اپنی ماں کو بے اولاد، بیوی کو بیوہ اور اولاد کو یتیم کرنا ہو تو وہ حدودِ حرم سے باہر آ کر میرا مقابلہ کر لے۔'' کسی قریش سردار کو آپؓ کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ

ہوئی آپ کو ''فاروق'' کا خطاب اسی وجہ سے ملا تھا کہ آپؓ نے حق اور باطل کے درمیان فرق کر کے دکھا دیا تھا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔اس کا سبب یہ ہے کہ آپؓ دین اسلام اور اسلامی نظام کی روح سے واقف تھے۔ چنانچہ اذان کا طریقہ آپؓ ہی کی رائے کے مطابق طے ہوا۔غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آپؓ نے جو رائے دی اس کی تائید میں وحیٔ الٰہی نازل ہوئی۔حجاب (پردہ) کے احکامات بھی آپؓ کی رائے کے مطابق ہی آئے تھے۔آپؓ کو قضاء کا منصب بھی حاصل تھا اور ایک یہودی کے مقابلے میں ایک منافق نے جب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے فیصلے کے بعد آپؓ سے فیصلہ کروانے کی کوشش کی تو آپؓ نے اس کا سر قلم کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی شخص رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے فیصلے کے بعد کسی اور سے فیصلہ مانگتا ہے تو اس کا فیصلہ قتل ہے۔اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اس فیصلے کی توثیق کی۔

حضرت عمر فاروقؓ نے عہدِ نبوی میں تمام غزوات میں شرکت کی۔غزوۂ احزاب میں بھی مجاہدانہ اور قائدانہ شان کے ساتھ شرکت کی۔غزوۂ تبوک کے موقعہ پر گھر کا آدھا اثاثہ پیش کیا۔غزوۂ خیبر میں بھی ایک روز اسلامی لشکر کی قیادت آپؓ کو سونپی گئی۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے خلاف کارروائی میں بھی آپؓ کا کردار بہت نمایاں تھا۔

صلح حدیبیہ میں آپؓ کو یک طرفہ شرائط پر تشویش تھی جس کا آپؓ نے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سامنے اظہار فرمایا اور سورۃ فتح نازل ہونے کے بعد آپؓ کا اضطراب دور ہوگیا۔فتح مکہ کے موقعہ پر بت شکنی کا فریضہ آپؓ کو بھی سونپا گیا۔

عہدِ صدیقیؓ میں آپؓ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مشیرِ خاص کی حیثیت حاصل تھی۔آپؓ دفاعی امور اور خارجہ پالیسی میں خصوصی مہارت رکھتے تھے اس لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ آپؓ کو ہمیشہ ساتھ ساتھ رکھتے تھے۔اسی وجہ سے آپؓ کو اسامہؓ بن زید کے لشکر میں شرکت کی بجائے مدینہ میں روک لیا گیا تھا۔شام و عراق کی جنگوں میں آپؓ کے مشورے قابلِ قدر تھے۔فتنۂ ارتداد کو فرو کرنے میں آپؓ کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔آپؓ شریعت کے اصولوں پر سختی سے عمل کرنے کے داعی تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاروق کا نظامِ حکومت

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسلامی حکومت عملاً قائم کی تھی اس لیے انتظامِ حکومت بھی آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں وجود میں آچکا تھا لیکن چونکہ اسلام کے ابتدائی دور میں اسلامی حکومت اتنی وسیع نہیں تھی اس لیے اس کی ضروریات بھی محدود تھیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وفات کے بعد شام و عراق کی فتوحات سے اسلامی حکومت میں توسیع ہوگئی اس لیے بہت سی نئی ضروریات اور کئی ایک نئے مسائل پیدا ہوگئے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عہدِ خلافت نہایت مختصر تھا۔ان کی خلافت کے دونوں سال اندرونی مخالفتوں کو فرو کرنے اور بیرونی دشمنوں کے خلاف دفاع میں صرف ہوگئے۔اس کے برعکس حضرت عمرؓ کا زمانہ خلافت ساڑھے دس سال تھا اور اکثر و بیشتر فتوحات آپؓ ہی کے عہدِ خلافت میں ہوئیں اس وجہ سے آپؓ نے ہر انتظامی دقت کو دور کیا اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اصولوں پر ایک مفصل انتظامی ڈھانچہ تعمیر فرمایا جو اسلامی حکومت کا مثالی نظام ہے۔خلافت راشدہ کے باقی ادوار میں اسی انتظامی ڈھانچہ کو قائم رکھا گیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اس میں حسبِ ضرورت معمولی تبدیلیاں کیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے

کہ خلافتِ راشدہ کا انتظام حضرت عمرؓ کے طے شدہ خطوط پر قائم رہا۔

مرکزی نظام

خلیفہ، خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۃ الرسول کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اسے خدا اور رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے حکم کے خلاف کوئی حکم دینے کا اختیار نہ تھا۔ عوام کے لیے ضروری تھا کہ اس کے ہر جائز حکم کی اطاعت کریں لیکن ناجائز حکم کو ماننے پر خلیفہ کسی کو مجبور نہ کر سکتا تھا۔ خلیفہ امورِ سلطنت شوریٰ اور عوام کے مشورے سے سرانجام دیتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں اس کے لیے ''امیر المومنین'' کا لفظ استعمال کیا جانے لگا۔

خاص حالات میں اور مہماتی امور کے متعلق تمام اہل مدینہ سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں مجلس مشاورت ہوتی تھی اور ہر شخص کو پوری آزادی رائے حاصل تھی۔ عام مسلمان بھی اپنی رائے کو پوری شدومد سے پیش کرتے ہوئے حکومت اور خلیفہ پر تنقید کرنے کا پورا حق رکھتا تھا۔

صوبائی نظام

سلطنت اسلامیہ آٹھ صوبوں مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر، فلسطین میں منقسم تھی۔ ایران کے تین صوبے خراسان، آذربائیجان اور فارس اس کے علاوہ تھے۔

ہر صوبہ انتظامی سہولت کے لیے چھوٹے چھوٹے اضلاع میں منقسم تھا اور ضلع کئی تحصیلوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس طرح ملک کا انتظام و انصرام کرنا نسبتاً آسان تھا۔ اس انتظام کو مزید مؤثر بنانے کے لیے ہر صوبے میں عہدیدار مقرر کیے جاتے تھے۔ جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

i- گورنر جسے ''والی'' کہا جاتا تھا۔ ii- جنرل سیکرٹری
iii- کلکٹر جسے ''عامل'' کہا جاتا تھا۔ iv- سیکرٹری شعبہ دفاع یعنی کاتب دیوان
v- پولیس افسر (صاحب الشرطہ) vi- خزانچی vii- قاضی
viii- بعض اوقات افواج کا سپہ سالار الگ مقرر کیا جاتا تھا۔

ہر گورنر کی تقرری کے وقت اس کے فرائض اور حقوق لکھ کر دے دیے جاتے تھے۔ ان سے بعض چیزوں کا حلف لیا جاتا تھا مثلاً یہ کہ وہ سادہ زندگی بسر کریں گے۔ اپنے مکان کے آگے صحن تعمیر نہیں کریں گے اور دربان مقرر نہیں کریں گے۔

ان کی تقرری کے وقت ان کی جائیداد کی فہرست تیار کر لی جاتی تھی اور انھیں اپنی آمد و خرچ کا حساب رکھنا پڑتا تھا۔ اگر کبھی یہ ثابت ہو جاتا کہ کوئی چیز زائد ہے تو آدھی جائیداد ضبط کر لی جاتی تھی۔

ذرائع آمدن

1- زکوٰۃ

صاحبِ نصاب مسلمانوں سے ان کی جمع شدہ رقوم، سونے چاندی، تجارتی مال اور ضرورت سے زائد جائیداد پر اڑھائی فیصد سالانہ زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔ نصاب وہی تھا جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں تھا۔ یہ جمع شدہ زکوٰۃ مستحق مسلمانوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے عاملین بھی اس مد سے تنخواہیں پاتے تھے۔

2- خُمس

جنگوں سے جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا اس کا پانچواں حصہ بیت المال میں آتا تھا اور حکومت کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس کو خُمس کہا جاتا تھا۔

3- عُشر

زمین کی پیداوار کا ایک حصہ اسلامی حکومت مالیہ کے طور پر وصول کرتی تھی۔ بارانی زمینوں سے پیداوار کا 1/10 اور خود سیراب کردہ زمین سے پیداوار کا 1/20 وصول کیا جاتا تھا۔

4- جزیہ

غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت کے عوض جزیہ وصول کیا جاتا تھا، البتہ محتاجوں پر یہ ٹیکس معاف ہوتا تھا۔ وہ غیر مسلم بھی اس ٹیکس سے مستثنٰی ہوتے تھے جو اپنے آپ کو فوجی خدمت کے لیے پیش کر دیتے تھے۔

5- خراج

خراج ان مفتوحہ علاقوں سے وصول کیا جاتا تھا جنھوں نے کسی معاہدے کے تحت اطاعت قبول کی ہو۔ اس کی شرح معاہدے کی شرائط میں طے کر دی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے مصر، شام اور عراق کی زمینوں کو بھی خراجی قرار دیا اور ان کا خراج خود مقرر فرمایا۔

6- عشور

شام و روم کی حکومتیں مسلمانوں کے تجارتی مال پر دس فیصد مالیہ وصول کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے بھی صحابہ کرامؓ کے مشورے سے غیر ملکی تاجروں کے مالِ تجارت پر یہ مالیہ عائد کر دیا۔ بعد میں رفتہ رفتہ مسلم و غیر مسلم سب سے وصول کیا جانے لگا۔

7- فے زمینیں

فے زمینیں وہ زمینیں تھی جو اسلامی حکومت ہی کی ملکیت تھیں اور ان کی آمدنی براہ راست بیت المال میں جمع ہوتی تھی۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں با قاعدہ بیت المال قائم نہیں ہوا تھا۔حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المال قائم کیا۔

رفاہ عامہ کے کام

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں رفاہ عامہ کے لیے سرکاری دفاتر تعمیر کیے۔جیل خانے تعمیر کروائے اور بیت المال قائم کیا۔ زراعت کی ترقی کے لیے نہریں تعمیر کی گئیں جن میں نہر خوزستان اور نہر امیر المومنین بہت مشہور ہیں۔نیز بہت سی چراگاہیں بنا کر عوام کے لیے وقف کی گئیں۔

عدلیہ

عدلیہ کے شعبے میں قاضی اس شخص کو مقرر کیا جاتا تھا جو عاقل و بالغ مرد اور ملک کا آزاد مسلمان شہری ہو۔بے داغ کردار کا مالک ہو۔قاضی بالعموم اچھی مالی حیثیت کے مالک ہوتے تھے۔ان کو نہایت معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

عدلیہ کا دوسرا شعبہ افتا تھا اور اس شعبے کا فرض لوگوں کو مفت قانونی مشورے دینا تھا۔اس مقصد کے لیے کبار صحابہ کرامؓ اور صرف فقیہ لوگوں کو مقرر کیا جاتا تھا۔یہ لوگوں کو دینی مسائل بھی بتاتے تھے اور حسبِ ضرورت قانون اسلامی کی تشریح بھی کرتے تھے۔اسلامی نظام حکومت کی قابل ذکر بات یہ تھی کہ قاضی با اختیار ہوتا تھا۔وہ گورنر کے سامنے جواب دہ نہیں تھا بلکہ براہِ راست خلیفۂ وقت کے ماتحت تھا۔

قیامِ امن

وسیع و عریض سلطنت میں قیامِ امن بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔اس مقصد کے لیے حضرت عمرؓ نے با قاعدہ شعبہ پولیس قائم کیا جس کے ذمّہ ملک میں امن وامان قائم رکھنا تھا۔رات کو اور خطرے کے وقت پہرہ دینے کے لیے پولیس کے دستے متعین کیے جاتے تھے۔ خطرناک افراد کے لیے جیل خانے تعمیر کیے گئے نیز امن دشمن لوگوں کو ملک بدر کر دیا جاتا تھا۔اس طرح حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے قائم کردہ شعبہ پولیس کی تکمیل کی۔

فوجی نظام

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور صدیق اکبرؓ کے زمانے میں فوج کا با قاعدہ شعبہ موجود نہیں تھا۔حضرت عمرؓ نے بڑھتی ہوئی فوجی ضروریات کے پیشِ نظر ولیدؓ بن ہشام کے مشورے سے اس شعبہ کو قائم کیا۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہے اس لیے تمام مومن مجاہد تھے۔حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں کوئی با قاعدہ فوج نہ تھی لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں تیس ہزار فوج سالانہ بھرتی کی جاتی تھی اور بالعموم دس لاکھ فوج با قاعدہ تنخواہ دار ہر وقت تیار رہتی۔فوج میں مہاجرین اور انصار کے علاوہ عام عرب غیر عرب مسلمان اور مفتوحہ قوموں کے افراد بھی بھرتی ہوتے تھے۔جنگی مہمات کی

کامیابی اور دفاعی ضرورتوں کے لیے ملک کے طول وعرض میں مختلف چھاؤنیاں بنائی گئی تھیں جنھیں ''جند'' کہتے تھے۔

اسلامی فوج کا سربراہ اعلیٰ خود خلیفہ ہوتا تھا اور اسی کے مقرر کردہ مختلف سپہ سالاروں کے ماتحت فوجیں روانہ ہوتی تھیں۔ فوج بالعموم تین حصوں میں منقسم ہوتی تھی میمنہ، میسرہ اور قلب۔ ہراول دستہ فوج کے آگے جاتا تھا اور دشمن کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا تھا۔ اصل فوج درمیان میں رہتی تھی اور پشت پر ایک حفاظتی دستہ متعین ہوتا تھا کہ پیچھے سے اچانک حملہ نہ ہو سکے۔

فوج کے ہر سپاہی کو چار ماہ کے بعد رخصت دی جاتی تھی تا کہ وہ چند روز اپنے اہل وعیال میں گزار آئے۔ نیز فوجی کارروائیوں کے دوران بھی مسلمان جمعہ کے دن کی چھٹی مناتے تھے۔ ابتدا میں رسد کا نظام ضرورت کے وقت ہوتا تھا پھر اس کا مستقل محکمہ قائم کر دیا گیا۔

مسلمان فوج بالعموم قرونِ وسطیٰ کے مروجہ ہتھیار استعمال کرتی۔ تلوار تیر کمان، نیزوں کے علاوہ منجنیق اور دبابہ کا استعمال بھی ہوتا تھا۔

عہدِ فاروقی کی فتوحات

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں بے شمار فتوحات حاصل کی گئیں جن میں چند ایک کا ذکر حسبِ ذیل ہے:

عہد فاروقی کے آغاز میں ایرانی ملکہ بوران وخت نے زبردست تیاریوں کے بعد ازسرِ نو جنگ کا آغاز کیا، مشہور ایرانی بہادر رستم کو مہم کا انچارج بنایا گیا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو اسلامی فوج کا سپہ سالار بنایا۔ ایرانی فوج دریائے فرات کے کنارے جسر کے مقام پر خیمہ زن ہوئی اور ابوعبیدہؓ دوسرے کنارے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ انھوں نے دریا کو عبور کر کے ایرانی فوج پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں مسلمان سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ شہید ہوئے اور مسلمان فوج کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

جنگ قادسیہ

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کی شہادت کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو سپہ سالارِ اعظم مقرر کر کے بیس ہزار فوج کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا۔ اس لشکر میں سابقون الاولون کی خاصی تعداد تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں رکھی اور ہر منزل پر ترتیب فوج اور مورچہ بندی تک کے متعلق ہدایات بھیجتے رہے۔ ایرانی اور اسلامی فوجیں قادسیہ کے مقام پر بالمقابل ہوئیں۔ حضرت عمرؓ کی ہدایات کے مطابق فوج کو ترتیب دیا گیا۔

سعدؓ بن ابی وقاص نے سب سے پہلے اشعث بن قیس اور عمرو بن معدی کرب کو تبلیغ اسلام کے لیے رستم کے پاس بھیجا۔ اس نے اسلام کی دعوت کو رد کرتے ہوئے از راہِ تمسخر تھوڑی سی خاک مسلمانوں کو دے دی کہ ہماری سرزمین میں سے تمھارا حصہ یہ ہے۔ عمرو بن معدی کرب نے اپنے لشکر کو خاک دکھائی اور کہا کہ دشمن نے خود اپنی زمین تمہارے حوالے کر دی ہے۔

صبح صادق سے پہلے ہی میدان جنگ ایرانی فوجوں سے بھر گیا۔ سعدؓ بن ابی وقاص بیماری کی وجہ سے عملاً میدانِ جنگ میں نہ جا سکے لیکن ایک بلند مقام سے فوج کو ہدایات دیتے رہے۔ یہ جنگ تین دن تک جاری رہی۔ لڑائی کے دوسرے روز مسلمانوں کو تازہ دم کمک بھی پہنچ گئی اس لیے جنگ شدید رہی۔ تیسرے روز ایرانی ہاتھیوں نے مسلمانوں کے لیے سخت مشکل پیدا کر دی کیونکہ ان سے گھوڑے

بدکتے تھے۔ بالآخر نیزہ بازوں کی جماعت نے اس آفت ناگہانی کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں نے ہاتھیوں پر بھرپور وار کر کے ان کی سونڈیں کاٹ ڈالیں جس سے ایرانی ہاتھی اپنی ہی فوج کو روندتے ہوئے بھاگ اٹھے۔ یہ جنگ رات بھر جاری رہی اور اگلے روز دوپہر کو جنگ کا فیصلہ ہوا۔ رستم زخموں سے چور ہو کر بھاگ کھڑا ہوا لیکن ندی عبور کرتا ہوا پکڑا گیا اور قتل ہوا۔ اس جنگ میں بیس ہزار ایرانی فوج مقتول ہوئی۔

قادسیہ کی شکست نے ایرانی قوت کا خاتمہ کر دیا اگرچہ جنگ جاری رہی لیکن درحقیقت اس جنگ نے ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا اور اس کے بعد مسلمانوں نے مدائن، جلولہ، جزیرہ، خوزستان اور نہاوند پر یکے بعد دیگرے ایرانیوں کو شکست دے کر ایران پر قبضہ کر لیا۔

شام کی فتح

خالدؓ بن ولید جب یرموک پہنچے تو حضرت صدیق اکبرؓ کا وصال ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں شام کی فتوحات جاری رہیں۔ مسلمانوں نے جنگِ یرموک میں شامیوں کو زبردست شکست دے کر شام کے اکثر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

بیت المقدس کی فتح

یرموک کی فتح کے بعد عمروؓ بن العاص نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مقدس شہر بیت المقدس کا محاصرہ کیا۔ ناکام مدافعت کے بعد اہالیان شہر نے اس شرط پر صلح کی پیش کش کی کہ امیر المومنین خود آ کر صلح کا معاہدہ لکھیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ خود تشریف لے گئے اور معاہدہ صلح لکھ کر شہر پر قبضہ کر لیا۔

قیساریہ کی فتح

بیت المقدس کی فتح کے بعد دو نہایت اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے ایک یہ کہ خالدؓ بن ولید کو معزول کر دیا گیا۔ دوسرے یہ کہ طاعون کی وبا اسلامی فوج میں پھوٹ نکلی جس سے پچیس ہزار مسلمان جن میں ابوعبیدہؓ اور معاذؓ بن جبل بھی شامل تھے، قادر مطلق سے جا ملے۔ شام تقریباً فتح ہو چکا تھا۔ صرف قیساریہ کا علاقہ باقی تھا جسے امیر معاویہ نے فتح کر کے شام کی تسخیر مکمل کر دی۔

مصر کی فتوحات

فسطاط کی فتح

مصر کی فتح کی دو وجوہات تھیں ایک مصر کی خوشحالی دوسری شام کا تحفظ۔ عمروؓ بن العاص نے دربارِ خلافت سے حملہ کی اجازت حاصل کر کے مصر پر چڑھائی کر دی۔ سرحدی جھڑپ کے بعد مسلمان مصر میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلا اہم مقابلہ فسطاط کے شہر میں ہوا۔ حضرت زبیر بنؓ عوام دس ہزار امدادی فوج کے ساتھ مدینہ سے مصر پہنچے۔ ایک دن حضرت زبیرؓ نے چند بہادروں کو ساتھ لیا اور شہر کی فصیل پر چڑھ کر دروازے کھول دیے۔ اسلامی لشکر فاتحانہ انداز سے شہر میں داخل ہو گیا۔

اسکندریہ کی فتح

عمروؓ بن العاص یکے بعد دیگرے کئی چھوٹے چھوٹے شہر فتح کرتے ہوئے اسکندریہ پہنچے۔ مقوقش شاہ مصر یہیں مقیم تھا اس نے مسلمانوں سے مرعوب ہو کر در پردہ اپنی قوم کی طرف سے معاہدہ کر لیا۔ رومیوں نے مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا سکے اور شہر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ اسکندریہ کے بعد مصر میں کوئی اہم مقام نہیں رہ گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے فوجی دستے بھیج کر ملک کے طول و عرض پر قبضہ کر لیا گیا۔

شمالی افریقہ کی فتوحات کی ابتدا

حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں عمروؓ بن العاص نے شمالی افریقہ کی تسخیر کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے برقہ کا محاصرہ کیا گیا۔ وہاں کے لوگوں نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔ اس کے بعد عقبہ بن نافع کو ذیلہ بھیجا گیا۔ یہ علاقہ بھی مطیع ہو گیا۔ اس طرح سے حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلامی حدود سلطنت طرابلس تک وسیع ہو گئیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت

23ھ کو حضرت عمرؓ کو نماز فجر ادا کرتے ہوئے ایک ایرانی غلام نے شہید کر دیا۔

مشقی سوالات

1- درج ذیل سوالات کے تفصیلی جواب تحریر کریں:

i- حضرت عمر فاروقؓ کے بحیثیت منتظم کردار کا جائزہ لیں۔

ii- حضرت عمر فاروقؓ کے دور کی اہم فتوحات مختصراً بیان کریں۔

iii- حضرت عمر فاروقؓ نے فوجی نظام کو کیسے منظم کیا تفصیل سے تحریر کریں۔

iv- حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں اسلامی ریاست کے ذرائع آمدن کی تفصیل لکھیں۔

v- خلیفہ بننے سے قبل حضرت عمر فاروقؓ کی خدمات بیان کریں۔

2- درج ذیل کے مختصر جواب تحریر کریں:

i- اپنی لونڈی کی اسلام پر استقامت نے حضرت عمرؓ کو کیا سوچنے پر مجبور کیا؟

ii- حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کے فوراً بعد مسلمانوں میں کیا تبدیلی آئی؟

iii- حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے کن دو لوگوں کے بارے میں دعا کی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک اسلام قبول کر لے۔

iv- ہجرت مدینہ کا حکم ملنے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے سردارانِ قریش سے خانہ کعبہ میں کیا کہا؟

v- حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں گورنر مقرر کرنے سے قبل ان سے کیا عہد لیا جاتا تھا؟

-vi جزیہ کیا تھا؟

-vii خراج کن مفتوحہ علاقوں سے وصول کیا جاتا تھا؟

-viii عدلیہ کے شعبہ افتا کا کیا فرض تھا؟

-ix حضرت عمر فاروقؓ کی بنوائی ہوئی دو نہروں کے نام لکھیں۔

-x غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت عمر فاروقؓ کا کیا کردار تھا؟

-3 مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پر کریں:

-i حضرت عمر فاروقؓ کا تعلق........................سے تھا۔

-ii حضرت عمر فاروقؓ کی لونڈی........................نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

-iii حضرت عمر فاروقؓ کو........................کا منصب بھی حاصل تھا۔

-iv صلح حدیبیہ کے وقت سورۃ........................نازل ہونے سے حضرت عمرؓ کی پریشانی دور ہوئی۔

-v حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں خلیفہ کے لیے........................کا لفظ استعمال ہونے لگا۔

-vi زمین کی پیداوار کا........................حصہ اسلامی حکومت مالیہ کے طور پر وصول کرتی تھی۔

-vii فے زمینوں کی آمدنی براہِ راست........................میں جمع ہوتی تھی۔

-viii حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں........................ہزار فوج سالانہ بھرتی کی جاتی تھی۔

-ix حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں فوج کے ہر سپاہی کو........................کے لیے رخصت دی جاتی تھی۔

-x قیام امن کے لیے حضرت عمر فاروقؓ نے باقاعدہ شعبہ........................قائم کیا۔

خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

24ھ تا 35ھ بمطابق 644ء تا 656ء

سیرت و خدماتِ اسلامی

حضرت عثمان بن عفانؓ کا تعلق قریش کے معروف قبیلہ بنوامیہ سے تھا۔ آپؓ کے والد ماجد مکہ کے بلند پایہ تاجروں میں سے تھے۔ ان کا انتقال بھی ایک تجارتی سفر کے دوران ہوا۔ انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے ایک کثیر رقم اور عمدہ کاروبار وراثت میں چھوڑا۔ حضرت عثمانؓ خود بھی بہت باصلاحیت تاجر تھے۔ انھوں نے اس میں مسلسل ترقی کی۔ عمر میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کم و بیش چھ سال چھوٹے تھے۔

قبولِ اسلام

حضرت عثمانؓ فطری شرم و حیا کے سبب اچھے لوگوں کی صحبت پسند کرتے تھے۔ آپؓ کی سب سے زیادہ دوستی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تھی۔ آپؓ نے انھی کی دعوت پر اسلام قبول کیا۔

خدماتِ اسلام

بے پناہ سخاوت

حضرت عثمانؓ شروع ہی سے فیاض طبع تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد آپؓ نے اسلام کی اشاعت کے لیے فراخ دلی سے مالی تعاون کیا۔ آپؓ ایک سمجھدار تاجر تھے۔ بہت جلد آپؓ نے اتنی کمائی کر لی کہ مدینہ کے مالدار ترین لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ فیاضی و دولت مندی نے آپؓ کو "غنی" کے بلند مقام پر فائز کیا۔

میٹھے پانی کا کنواں

مدینہ میں پانی کی قلت تھی۔ میٹھے پانی کا کنواں بئیر رومہ ایک یہودی کی ملکیت تھا جو پانی کی اتنی قیمت طلب کرتا تھا کہ عوام کے لیے ادائیگی مشکل ہو جاتی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اس کنویں کو اس سے خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ بعد ازاں غیر مسلموں کے لیے بھی اس کنواں سے پانی کے حصول کے لیے باری مقرر کر دی گئی۔

جہاد میں شرکت

حضرت عثمان غنیؓ، حضرت رقیہؓ کی بیماری اور وفات کے سبب غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے لیکن باقی تمام اسلامی جنگوں میں آپؓ نے شرکت کی۔ غزوۂ احد میں آپؓ ان ثابت قدم صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو آخر وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دفاع کے

لیے ان کے ساتھ رہے۔ یہود قبائل کے خلاف کارروائیوں کے علاوہ آپؓ نے غزوۂ خندق میں بھی شرکت کی۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر آپؓ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا گیا تھا اور جب آپؓ کی شہادت کی افواہ پھیلی تو حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنے ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر صحابہ کرامؓ سے ''بیعتِ رضوان'' لی تا کہ آپؓ کے خون کا قصاص لیا جا سکے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی آپؓ کی طرف سے بیعت آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔

مال کے ساتھ جہاد

حضرت عثمان غنیؓ کا ایک اور شرف آپ کا جہاد بالمال ہے۔ آپؓ کو اللہ تعالیٰ نے وسیع رزق کے ساتھ ساتھ فراخ دلی بھی عنایت کی تھی۔ دین اسلام میں سبقت اور دین کی اشاعت کے ساتھ قلبی وابستگی کے سبب آپؓ نے ہر موقعہ پر اپنے مال کو بے دریغ خرچ کیا۔

انتخاب بطور خلیفہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں آپؓ ان چند صحابہ کرامؓ میں سے تھے جن سے ہر معاملہ میں مشورہ کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی آپ کو ہر مشورہ میں شریک رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی، اس کے آپؓ بھی رکن تھے۔ خلافت کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی میں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، عبدالرحمنؓ بن عوف، حضرت علیؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص کے علاوہ آپؓ کا نام بھی شامل تھا اور ان کو اکٹھا کرنے اور کسی فیصلہ پر پہنچانے کی ذمہ داری حضرت مقدادؓ پر تھی۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کا نام تجویز کیا۔ بالآخر فیصلہ کا اختیار عبدالرحمنؓ بن عوف کو دے دیا گیا۔ جنھوں نے عوام کی رائے معلوم کر کے فیصلہ حضرت عثمانؓ کے حق میں کیا اور مسلمانوں نے مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم میں جمع ہو کر اتفاق رائے سے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

پہلا مقدمہ

حضرت عثمانؓ کے سامنے سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ بن عمر کا مقدمہ پیش کیا گیا جنھوں نے ہرمزان کو قتل کر دیا تھا۔ اسلامی قانون کی رو سے انھیں قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا اختیار نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ نے محسوس کیا کہ کل حضرت عمرؓ شہید ہوئے ہیں، آج ان کے بیٹے کو قتل کروانا اچھا نہیں لگتا، اس لیے آپ نے ہرمزان کے قتل کی دیت اپنی جیب سے ادا کر کے عبداللہؓ کو رہا کر دیا۔

حضرت عثمان غنیؓ کی فتوحات کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے عملاً عجم کو دوبارہ فتح کیا اور اس میں کابل و غزنی کا اضافہ بھی کیا۔ مغربی حجاز پر مصر کی بغاوت کے خاتمے کے علاوہ شمالی افریقہ کے بہت سے ممالک فتح ہوئے۔ بحیرۂ روم کے جزائر اسلامی مملکت میں شامل ہوئے جبکہ اندلس پر حملہ کا آغاز کر دیا گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک کے عوامل

-1 حضرت ابوبکر صدیقؓ و حضرت عمر فاروقؓ کے زمانوں میں صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد موجود تھی، لہٰذا سلطنت کے مختلف کام ان کے ذمہ لگائے جاتے تھے۔ وہ صحابہ کرامؓ نہ صرف اسلام کے سانچے میں ڈھل چکے تھے بلکہ انھوں نے اپنے خون پسینے سے شجرِ حق کی آبیاری بھی کی تھی، اس لیے ان میں اس کا پورا درد موجود تھا۔ نئی نسل نہ تو اتنی مخلص تھی نہ ہی اتنی تربیت یافتہ۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک کافی صحابہؓ وفات پا چکے تھے، اس وجہ سے جب لوگ عثمانیؓ دور کا تقابل فاروقیؓ عہد سے کرتے تھے تو غیر مطمئن ہو جاتے تھے۔

-2 حضرت عثمانؓ دولت کے ریلے کو دیکھ کر رو یا کرتے تھے کیونکہ انھیں احساس تھا کہ دولت کی فراوانی مادہ پرستی میں اضافہ کرتی ہے اور تقویٰ و یادِ الٰہی سے غافل کر دیتی ہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک مالِ غنیمت کی تقسیم سے لوگوں کا معیارِ زندگی بہت اونچا ہو چکا تھا اور اسی حساب سے ان کی روحانیت پر ان کی مادیت غالب آ گئی تھی۔

-3 مفتوحہ قوموں نے دل سے اسلامی حکومت کی اطاعت قبول نہ کی تھی بلکہ سیاسی شکست کے نتیجہ کے طور پر اسلام کو قبول کیا تھا۔ ان کے اندر ابھی تک انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔

-4 حضرت عثمانؓ کے دور میں قریش مفتوحہ علاقوں میں زمینیں خرید کر آباد ہو گئے۔ یہ بات قدیم باشندوں کے لیے پسندیدہ نہ تھی۔ عربی و عجمی کی اس رقابت میں خلیفۂ وقت پر عرب امرا کی حمایت کا الزام آیا۔ یہ بات متقی اور حساس لوگوں کے لیے تکلیف دہ تھی۔

-5 حضرت عثمانؓ نے زیادہ عمال بنوامیّہ سے مقرر فرمائے تھے کیونکہ ان کی وفاداریاں زیادہ قابلِ اعتماد تھیں لیکن ان کے مخالفین نے اسے کنبہ پروری اور اقربانوازی قرار دے کر آپؓ کے خلاف لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا۔

-6 سب سے بڑی وجہ حضرت عثمان غنیؓ کی نرم مزاجی تھی۔ طبیعت کی یہ نرمی امورِ سلطنت کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی جس کے باعث لوگ گستاخ اور نافرمان ہو گئے اور اپنی آزادی کی حدود پھلانگ کر ایسی حرکتیں کرنے لگے جو مفادِ عامہ کے منافی تھیں۔

-7 حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت کے ابتدائی سالوں میں بغاوتوں کا سدِ باب کیا گیا۔ ایران، فارس اور مصر کو از سرِ نو فتح کیا گیا لیکن بہت جلد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ جہادی سرگرمیاں کم ہو گئیں۔ اس سے مسلمانوں میں وہ اتحاد جو خارجی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا سرد پڑ گیا۔

-8 عبداللہ بن سبا ایک یہودی تھا جو غلبۂ اسلام کے سبب بظاہر مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے نہایت چالاکی کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی نرمی کی وجہ سے ان کے خلاف بے اطمینانی اور مفتوحہ قوموں کے مخالفانہ جذبات سے فائدہ اٹھایا۔

شہادت کے واقعات

عبداللہ بن سبا نے اہلِ بیت کی حمایت کا نعرہ لگاتے ہوئے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنا شروع کیا اور شام و عراق کا سفر کر کے مختلف جگہوں پر خفیہ جماعتیں بنائیں جو ان عقائد کا پرچار کرتی تھیں۔

i- اس نے حمایت اہل بیت کے سلسلے میں عجیب وغریب اور نئے عقائد لوگوں میں پھیلائے۔

ii- وہ مسلمانوں کو تبلیغ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ یاد دلا کر اپنے ساتھ ملاتا تھا۔

iii- حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ گورنروں کو ہر طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کرتا تھا اوران کے مظالم کی فرضی داستانیں دور دراز کے صوبوں میں بیان کی جاتیں جن کی تصدیق اس زمانے میں ممکن نہ تھی۔

iv- حضرت عثمانؓ کی کنبہ پروری کی داستانیں گھڑ گھڑ کر مشہور کرنا اس کا خاص حربہ تھا۔

سب سے پہلے اس تحریک کے اثرات کوفہ میں ظاہر ہونے لگے۔ وہاں مالک بن اشتر نخعی کی قیادت میں ایک گروہ تیار ہو گیا جو کھل کر حضرت عثمانؓ کی مخالفت کرتا تھا۔ وہاں کے حاکم سعید بن العاصؓ کی رپورٹ پر خلیفہ نے اس گروہ کے راہنماؤں کو شام میں حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بھیج دیا۔ سعید بن العاصؓ نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ انتشار کی بنیاد پر میری مخالفت پر ادھار کھا رہے ہیں تو انھوں نے خود حضرت عثمانؓ سے کہا کہ لوگ مجھے نہیں چاہتے میری بجائے ابوموسیٰ اشعریؓ کو مقرر فرما دیجیے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ مطالبہ مان لیا۔ اس کے باوجود بھی فتنہ ختم نہ ہوا تو حضرت عثمانؓ نے چھوٹے صوبوں میں بھی تحقیقات کے لیے آدمی بھیجے۔ سوائے عمار بن یاسرؓ کے جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے سبائیوں کے فریب میں آ گئے۔ باقی سب کی اطلاع یہ تھی کہ ہر طرف سکون ہے اور شورش کی اطلاعات من گھڑت ہیں البتہ صرف چند مفسد مخالفت پر آمادہ ہیں۔ امیر المومنین نے صرف مندرجہ بالا تحقیق پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اعلان عام کر دیا کہ جو لوگ میرے عمال کے خلاف شکایات رکھتے ہوں حج کے موقع پر اپنی شکایات پیش کر کے ازالہ کروا سکتے ہیں لیکن کوئی شکایت موصول نہ ہوئی کیونکہ مفسدین کا مقصد اصلاح نہیں بلکہ فساد پھیلانا تھا۔

حج کے زمانے میں حضرت عثمانؓ نے عام مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے ان کے سامنے ایک تقریر کی جس میں انھوں نے نہ صرف اپنے طرز عمل کی وضاحت کی بلکہ اپنے آئندہ لائحہ عمل پر روشنی بھی ڈالی۔

مصر کے باغیوں کا گروہ جو سب سے زیادہ شر پسند تھا تھوڑے دنوں کے بعد اچانک واپس پہنچ گیا۔ محمد بن مسلمہ کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انھیں راستہ میں ایک سرکاری قاصد ملا تھا جس کے قبضے میں گورنر مصر کے نام ایک فرمان تھا جس میں تمام باغیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ فرمان مروان بن حکم نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے لکھا تھا۔

اس دفعہ باغیوں نے اور زیادہ سختی سے خلافت سے دست برداری کا مطالبہ کیا اور حضرت عثمانؓ پر بدعہدی کا الزام لگایا، باوجود کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ یہ مروان بن حکم کی شرارت ہے۔ باغی کہتے تھے کہ جس شخص کی طرف سے خط لکھا جائے اس پر اس کی مہر لگائی جائے اور سرکاری ہرکارہ اس کو لے کر جائے جب کہ اسے خبر تک نہ ہو تو اسے خلافت سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ حضرت عثمانؓ یہ مطالبہ ماننے کو تیار نہیں تھے اور اپنی طبعی نرمی کی وجہ سے صحابہ کرامؓ کو باغیوں کے خلاف جنگ کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ باغیوں نے آپؓ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت علیؓ نے ان کو کسی نہ کسی طرح ہٹا دیا لیکن انھوں نے پھر سخت محاصرہ کر لیا۔ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت تحفظ ودفاع کے لیے حاضر خدمت ہوئی لیکن آپؓ نے سب کو واپس کر دیا۔ صرف حسینؓ بن علیؓ، محمد بن طلحہؓ، عبداللہؓ بن عباس اور عبداللہ بن زبیرؓ واپس نہ گئے نتیجۃً محاصرہ نہایت سخت کر دیا گیا اور حضرت علیؓ کو بھی اندر جانے سے منع کر دیا گیا۔

اُمّ المومنین ام حبیبہؓ سمجھانے آئیں تو ان کی سواری کو بھی زخمی کر دیا گیا۔ جب حضرت عثمانؓ کو یقین ہو گیا کہ یہ ظالم قتل کیے بغیر ٹلنے والے نہیں ہیں تو انھوں نے اتمامِ حجت کے طور پر ان کے سامنے مختصر تقریر کی۔ یہ تقریر نہایت پر سوز تھی اس کے باوجود باغیوں کے دل نہ پسیجے۔ اس تقریر میں حضرت عثمانؓ نے واضح کیا کہ کس طرح وہ امورِ سلطنت کی انجام دہی میں پوری دیانت داری سے کوشاں رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے فرائض کی ادائیگی میں کچھ غلطیاں ہوئی ہوں مگر بغاوت مسائل کا حل نہیں ہے۔ پھر آپؓ نے ان سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم مجھے کس جرم میں قتل کرنا چاہتے ہو۔ اسلامی شریعت میں قتل تین صورتوں میں جائز ہے۔ ایک مرتد ہونے کی صورت میں، دوسرے قتل کے قصاص میں اور تیسرے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرنے پر، میں نے ان فعلوں میں سے کوئی بھی نہیں کیا۔ نیز آپؓ نے انھیں تنبیہ کی اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو تم قیامت کے دن تک نہ اکٹھی نماز پڑھو گے اور نہ اکٹھے جہاد کرو گے لیکن وہ خلیفہ کے باغی نہیں بلکہ اسلام کے خلاف سازشی تھے۔ انھیں اتحادِ امتِ مسلمہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لیے ان پر اس تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا۔

باغیوں کی اس غیر معقول روش کا جواب صرف سختی تھا۔ عبداللہؓ بن زبیرؓ اور مغیرہؓ بن شعبہ نے جنگ کی اجازت طلب کی لیکن حضرت عثمانؓ کسی طور آمادہ نہ ہوئے اور امتِ مسلمہ کا خون بہانے سے انکار کر دیا۔ مغیرہؓ نے متبادل تجاویز پیش کیں کہ مکہ یا شام چلے جائیں کہ وہاں امن ہے لیکن حضرت عثمانؓ نے جوارِ رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور دیارِ الہجرت چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

18 ذی الحج 35ھ کو باغیوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دروازے پر حسینؓ بن علیؓ، محمدؓ بن مسلمہ اور عبداللہؓ بن زبیر پہرہ دے رہے تھے۔ انھوں نے ان کو روکا لیکن ظالموں نے دروازے کو آگ لگا دی۔ ان میں سے چند باغی متصل مکانوں پر چڑھ کر حضرت عثمانؓ کے مکان کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ تلاوتِ کلامِ پاک میں مصروف تھے۔ محمد بن ابی بکر نے آپؓ کو ڈاڑھی مبارک سے پکڑ لیا لیکن حضرت عثمانؓ نے اسے کہا "بھتیجے اگر تمھارے والد اس فعل کو دیکھتے تو ان کو یہ قطعاً پسند نہ آتا" اس پر وہ شرمندہ ہو کر لوٹ گیا۔ اس کے بعد غافقی نے بڑھ کر حملہ کیا۔ ایک اور باغی نے حضرت عثمانؓ کے ماتھے پر لوہے کی لاٹھ ماری جس سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا اور آپؓ گر پڑے جس کے بعد تیسرے باغی نے آپؓ کے سینے پر چڑھ کر کئی وار کیے۔ حضرت نائلہؓ بچاؤ کے لیے آگے بڑھیں تو ان کی تین انگلیاں کٹ گئیں۔ اسی اثنا میں ایک اور باغی نے دنیا کے سب سے زیادہ باحیا انسان کو شہید کر دیا۔ یہ شہادتِ عظمیٰ ایک معمولی واقعہ نہ تھا۔ امیر المومنین حضرت عثمانؓ ذوالنورین کی شہادت ایک ایسا واقعہ تھا جس سے مدینہ کا ہر شخص سخت پریشان ہوا کسی کو توقع نہ تھی کہ معاملات اس حد تک بگڑ جائیں گے۔ پریشانی کے عالم میں طرح طرح کے تبصرے ہو رہے تھے۔ سبائیوں نے اہل بیت کی خلافت کا عقیدہ پھیلایا تھا اس لیے حضرت علیؓ نے بے چینی کے عالم میں دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا "اے اللہ گواہ رہنا میں خونِ عثمانؓ سے بری ہوں"۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا تبصرہ تھا کہ اگر ساری مخلوق اس قتل میں شریک ہوتی تو اس پر آسمان سے پتھر برستے غرض ہر شخص اس قبیح فعل کی مذمت کر رہا تھا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے قبائلی تعصّبات کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن شہادتِ عثمانؓ کے بعد بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان پرانی رقابت ابھر آئی اور رفتہ رفتہ تمام جاہلی تعصّبات نے دوبارہ سر اٹھانا شروع کر دیا۔

شہادتِ عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا تو انھوں نے دار الخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا۔ اس تبدیلی کا مقصد تو یہ تھا

کہ باہمی کشمکش میں نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا شہر محفوظ رہے لیکن انھوں س فیصلہ کے منفی اثرات سامنے آئے کیونکہ شوریٰ میں اہل کوفہ کی نمائندگی بڑھ گئی اور رفتہ رفتہ اس کا دینی رنگ پھیکا پڑ گیا۔

شہادتِ عثمانؓ ایسا سانحہ تھا جس سے امتِ مسلمہ صراطِ مستقیم سے ہٹ گئی اور باوجود کوشش کے آج تک اتحادِ امتِ مسلمہ کا خواب پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

مشقی سوالات

1۔ درج ذیل کے تفصیلی جواب تحریر کریں۔

i- حضرت عثمانؓ کے خلاف اعتراضات والزامات کا جائزہ لیں۔

ii- حضرت عثمانؓ کی شہادت کن حالات میں ہوئی اور اس کے مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

iii- حضرت عثمانؓ کی مخالفت کے اسباب تفصیل سے تحریر کریں۔

iv- حضرت عثمانؓ کی سیرت وکردار پر جامع نوٹ لکھیں۔

2- مندرجہ ذیل کے مختصر جواب تحریر کریں۔

i- حضرت عثمانؓ نے کس کی دعوت پر اسلام قبول کیا؟

ii- حضرت عثمانؓ نے میٹھے پانی کا کنواں کس وجہ سے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کیا؟

iii- صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمانؓ نے کیا کردار ادا کیا تھا؟

iv- حضرت عمرؓ دولت کی فراوانی کو دیکھ کر کیوں رویا کرتے تھے؟

v- عبداللہ بن سبا نے حضرت عثمانؓ کی نرمی کا کس طرح فائدہ اٹھایا؟

3- مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پر کریں۔

i- حضرت عثمانؓ کا تعلق قریش کے معروف قبیلہ.................. سے تھا۔

ii- مدینہ میں میٹھے پانی کے کنویں کا نام.................. تھا۔

iii- حضرت عثمانؓ کے سامنے سب سے پہلے.................. کے صاحبزادے کا مقدمہ پیش ہوا۔

iv- حضرت عثمانؓ نے اپنے خاندان سے زیادہ.................. مقرر فرمائے۔

v- سب سے پہلے شہر.................. میں حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک کے اثرات ابھرے۔

vi- حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک کا محرک.................. ایک یہودی تھا۔

vii- حضرت عثمانؓ کی طرف سے مصری سازشیوں کو قتل کرنے کے بارے میں خط.................. نے لکھا تھا۔

viii- کوفہ کے لوگوں نے.................. کے علاوہ کسی اور کو بطور گورنر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

خلافتِ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

35ھ تا 41ھ بمطابق 656ء تا 661ء

حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے چچا ابوطالب کے صاحبزادے تھے۔نہایت چھوٹی عمر میں اسلام قبول کیا۔بچپن سے ہی آپؓ کی پرورش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی نگرانی میں ہوئی تھی، اس لیے جاہلیت کے کبھی قریب نہیں گئے۔ساری عمر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے دست و بازو رہے اور تقریباً تمام غزوات میں شرکت کی۔میدانِ بدر میں مغرور سرداران قریش ولید و شیبہ کو قتل کرنے والے آپؓ ہی تھے۔اُحد کے میدان میں بھی شجاعت و بہادری میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔قلعہ خیبر آپؓ ہی کی روحانی قوت سے مسخر ہوا تھا۔عرب کا مشہور پہلوان عمرو بن عبدود غزوۂ خندق میں آپؓ کے پہلے ہی وار کی تاب نہ لا سکا۔تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے آپؓ کاتبِ وحی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔خلافت راشدہ کے دور میں حضرت علیؓ مجلس شوریٰ کے ایک اہم رکن تھے۔

شہادتِ عثمانؓ کے بعد تین دن تک مدینہ میں بدامنی کا دور دورہ رہا۔شہر پوری طرح باغیوں کے قبضے تھا اور کسی کی جان محفوظ نہ تھی۔بالآخر باغیوں نے اہلِ مدینہ کو حکم دیا کہ وہ دو دن کے اندر خلیفہ کا انتخاب کریں۔حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔اس پر لوگوں کے مجبور کرنے پر حضرت علیؓ نے خلافت قبول کر لی۔حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے بھی آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حضرت علیؓ نے خلافت تو قبول کر لی تھی مگر حالات اس حد تک خراب ہو چکے تھے کہ ان پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔آپؓ کی مشکلات مختصراً مندرجہ ذیل تھیں:

سب سے پہلا مسئلہ حضرت علیؓ کے سامنے یہ تھا کہ ملک میں بدامنی اور خوف و ہراس کا دور دورہ تھا۔قانون ناکام ہو چکا تھا۔عوام اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے اس لیے یہ ضروری تھا کہ سب سے پہلے امن قائم کیا جائے۔

حضرت علیؓ کے لیے دوسرا اہم قصاصِ عثمانؓ کا مسئلہ تھا۔خلیفہ کی حیثیت سے آپؓ کا یہ فرض تھا کہ عثمانؓ کے قاتلوں سے انتقام لیا جائے اور ان پر شرعی حد جاری کی جائے لیکن قاتل کا سراغ لگانا آسان کام نہ تھا۔خود مفسدین بتانے کو تیار نہ تھے اور ان کے علاوہ صرف حضرت نائلہؓ موقع کی گواہ تھیں لیکن وہ پردہ نشین اور معمر خاتون تھیں۔نیز مدینہ سے باہر کے لوگوں کو وہ جانتی نہ تھیں اس لیے وہ صرف محمد بن ابی بکر کو پہچانتی تھیں جس کے بارے میں وہ خود گواہی دیتی تھیں کہ وہ شرمسار ہو کر واپس لوٹ گیا تھا۔اس لیے اولاً تو قاتل کی تلاش مشکل تھی اور اگر وہ مل بھی جاتا تو اس کو سزا دینا اور بھی زیادہ مشکل تھا۔

حضرت عثمانؓ ایک نرم مزاج حکمران تھے۔انھوں نے بالعموم اموی عمال مقرر کیے اور ان پر سخت کنٹرول قائم نہ رکھا۔حضرت علیؓ کے نزدیک وہ قابل اعتماد بھی نہ تھے اس لیے ان کو معزول کر کے نئے عمال کا تقرر حضرت علیؓ کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔

حضرت علیؓ کے لیے ایک دقت یہ بھی تھی کہ مفتوحہ قومیں دینی سمجھ بوجھ سے خالی تھیں اور پورے اخلاص کے ساتھ ایسی حرکتوں پر اصرار کرتی تھیں جو معاملات کو سلجھانے میں اپنی کم فہمی کو حضرت علیؓ پر مسلط کرتے۔چنانچہ جنگ صفین میں قرآن کے ورقوں کی وجہ سے جیتی

ہوئی جنگ کو ہارنا، ثالثوں کا تقرر اور ابوموسیٰ اشعریؓ کے تقرر پر اصرار ان کی واضح مثالیں ہیں لیکن سب سے بڑھ کر اس سلسلے میں قابل ذکر بات خوارج کا ظہور ہے۔ حضرت علیؓ نے مندرجہ بالا مشکلات پر قابو پانے کے لیے درج ذیل کوششیں کیں۔

حضرت علیؓ پوری کوشش کے باوجود حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ اسلامی قانون کے تحت کسی شخص کو قتل کے جرم میں سزا نہیں دی جاسکتی جب تک اس کے خلاف مطلوبہ شہادت موجود نہ ہو۔ چونکہ مفسدین شہادت دینے سے انکاری تھے اور حضرت نائلہؓ زوجہ حضرت عثمانؓ کسی کو نہیں پہچانتی تھیں اس لیے کسی پر حد جاری نہیں کی جاسکتی تھی۔ حضرت علیؓ کی یہ ناکامی بہت دوررس اثرات کا باعث بنی۔

حضرت علیؓ نے عبداللہؓ بن عباس اور مغیرہ بن شعبہ کے منع کرنے کے باوجود تمام اموی عمال کو یک قلم معزول کر دیا لیکن کوفہ والوں نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو قائم رکھنے پر اصرار کیا۔ ان کا یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ امیر معاویہؓ کی طرف سے پہلے ہی خدشہ تھا، چنانچہ حضرت امیر معاویہؓ نے بیعت کرنے اور معزول ہونے سے انکار کر دیا اور قصاص عثمانؓ کی دعوت لے کر حضرت علیؓ کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

جنگ جمل جمادی الثانی 36ھ 656ء

حضرت عائشہؓ حج بیت اللہ کے لیے مکہ میں مقیم تھیں۔ جب انھیں شہادت عثمانؓ کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے طور پر خود قصاص لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لیے روسائے مکہ کی مدد سے ایک عظیم الشان لشکر جمع کیا گیا اور یہ لشکر بصرہ کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت طلحہؓ وزبیرؓ بھی مدینہ سے مایوس ہو کر مکہ آ گئے تھے۔ انھوں نے بھی حضرت عائشہؓ کا ساتھ دیا۔ اس لشکر نے بہت آسانی سے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ حضرت علیؓ بھی اس لشکر کے اجتماع کی خبر سن کر بصرہ پہنچے اور قعقاع بن عمروؓ کو ام المومنینؓ کی خدمت میں روانہ کیا۔ قعقاعؓ نے ام المومنینؓ طلحہؓ اور زبیرؓ کو سمجھایا کہ حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے امیر المومنین کے ہاتھ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ بات معقول تھی اور دونوں گروہ مخلص تھے اس لیے مصالحت ہوئی۔ اس مصالحت کا اعلان دونوں فوجوں میں کرا دیا گیا لیکن رات کے وقت سبائیوں نے مشورہ کیا کہ اگر ان لوگوں میں مصالحت ہو جائے تو ان کی خیر نہیں لہٰذا جنگ چھیڑ دینی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے رات کو اچانک حضرت عائشہؓ کے لشکر پر حملہ کر دیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت علیؓ کو بتایا گیا کہ بدعہدی حضرت عائشہؓ کے لشکر کی طرف سے ہوئی ہے۔ اس لیے وہ بھی جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ دوران جنگ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ آمنے سامنے ہوئے تو آپؓ نے زبیرؓ کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وہ پیشین گوئی یاد دلائی کہ زبیرؓ کسی وقت تم علیؓ کے خلاف ناحق لڑو گے۔'' حضرت زبیرؓ فوراً جنگ سے علیحدہ ہو گئے لیکن ایک سبائی نے جنگ کو سرد ہوتے ہوئے دیکھ کر حضرت زبیرؓ کا تعاقب کیا اور راستے میں نماز پڑھتے ہوئے آپؓ کو شہید کر کے آپ کا سر لے کر حضرت علیؓ کے پاس پہنچا۔ حضرت علیؓ نے دیکھا تو فرمایا ''ابن صفیہ کے قاتل میں تمہیں دوزخ کی بشارت دیتا ہوں'' اس پر سبائی بہت بگڑا، حضرت طلحہؓ بھی حضرت زبیرؓ کی طرف دیکھ کر جنگ سے الگ ہو رہے تھے کہ ان کے اپنے لشکر میں سے مروان بن حکم نے ایک تیر سے حضرت طلحہؓ کو شہید کر دیا۔ جنگ حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے گرد ہو رہی تھی۔ حضرت علیؓ کے حکم سے اونٹ کے پاؤں زخمی کر کے اس کو بٹھا دیا گیا اور جنگ کا فیصلہ حضرت علیؓ کے حق

میں ہو گیا۔

یہ جنگ صریح غلط فہمیوں کی بنیاد پر لڑی گئی لیکن مومنین کے اس باہمی تصادم میں اسلام کو کافی نقصان پہنچا۔ حضرت علیؓ نے اس جنگ میں کسی مسلمان کو بلا ضرورت قتل کرنے اور لوٹ مار سے منع کر دیا تھا۔ تاہم اس دوران میں حضرت امیر معاویہؓ کو اپنی قوت مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔

جنگ صفین 11 تا 13 صفر 37ھ 657ء

کوفہ آنے کے بعد حضرت علیؓ نے جریر بن عبداللہ بجلی کے ذریعے حضرت امیر معاویہؓ کو ایک دفعہ پھر بیعت کرنے کی دعوت بھیجی لیکن انھوں نے جواب میں قاتلینِ عثمان کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ حضرت علیؓ کے بس میں نہ تھا، نتیجۃً دونوں فوجیں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کے لیے صفین کے میدان میں بالمقابل ہوئیں۔ مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور کئی ہفتوں تک جنگ ہوتی رہی۔ اس کے بعد حرام مہینوں کی آمد کی وجہ سے جنگ رک گئی۔ 11 صفر 37ھ کو دوبارہ جنگ کا آغاز ہوا۔ ہفتہ بھر کی شدید لڑائی کے باوجود کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ بالآخر فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی جو ایک دن رات اور اگلے دن دوپہر تک جاری رہی۔ اس میں ستر ہزار مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ بالآخر امیر معاویہ کو شکست ہوتی نظر آئی لیکن انھوں نے عمرو بن العاصؓ کے مشورے سے قرآن کے ورق نیزوں پر کھڑے کر کے یہ نعرے لگوانے شروع کر دیے کہ ہمارے اور تمھارے درمیان کتاب اللہ فیصلہ کرے گی۔ اس پر حضرت علیؓ کی فوج نے لڑنے سے انکار کر دیا اور حضرت علیؓ کو مجبوراً صلح کی گفت و شنید شروع کرنی پڑی۔ دونوں جانب سے ایک ایک ثالث مقرر ہوا اور حضرت امیر معاویہؓ کے ثالث کی ہوشیاری کی وجہ سے حضرت علیؓ جیتی ہوئی جنگ ہار گئے۔

جنگ نہروان

حضرت علیؓ کی اپنی صفوں میں انتشار واقع نہ ہو جاتا تو وہ دوبارہ حضرت امیر معاویہؓ کو شکست دے سکتے تھے لیکن ان کی فوج کے ایک حصے نے آیت ''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ فیصلے کا حق صرف اللہ کو ہے'' کی غلط تاویل کرنی شروع کر دی، حکمین کے تقرر کو شرک قرار دیا اور ایمان کے بعد شرک کرنے کو ارتداد۔ اس طرح سے ان کے خیال میں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ دونوں مرتد ہو گئے تھے اور واجب القتل تھے، یہ فرقہ خوارج کہلایا اور اس نے عبداللہ بن وہب راسبی کی قیادت میں حضرت علیؓ کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ مصالحت کی ہر کوشش کی ناکامی کے بعد نہروان کے مقام پر جنگ ہوئی۔ خوارج پوری بہادری سے لڑے لیکن میدان جنگ میں قتل ہوئے اور میدان حضرت علیؓ کے ہاتھ رہا۔ حضرت علیؓ کی فوج مسلسل جنگ و جدل سے تھک چکی تھی۔ خوارج کے خلاف جنگ نے اس کو بالکل تھکا دیا تھا اس لیے حضرت علیؓ کے آمادہ کرنے کے باوجود حضرت امیر معاویہؓ سے مقابلے کے لیے تیار نہ ہوئے اور مجبوراً حضرت علیؓ کو دارالخلافہ واپس جانا پڑا۔

حضرت علیؓ نے مصر پر قیس بن سعدؓ انصاری کو گورنر مقرر کیا تھا۔ انھوں نے لوگوں کے ساتھ سختی کرنے کی بجائے نرمی برتی اور

نہایت عقلمندی سے اکثریت کو حضرت علیؓ کی بیعت کرنے پر آمادہ کرلیا۔حضرت امیر معاویہؓ نے قیس کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔تاہم 40ھ تک امیر معاویہؓ نے جارحانہ اقدامات کر کے بہت سے دیگر علوی علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا تھا اور مکہ اور مدینہ پر بھی قبضہ کرنے کی تگ ودو شروع کردی تھی۔مکہ اور مدینہ کے لوگوں سے بھی زبردستی بیعت لینے کی کوشش کی گئی تھی۔عوام پر مظالم بھی ڈھائے گئے تھے۔حضرت علیؓ نے اس کش مکش سے تنگ آ کر صلح کر لی جس کی وجہ سے حجاز،عراق اور مشرق حضرت علیؓ کے پاس اور شام مصر اور مغرب امیر معاویہؓ کے پاس رہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت

19 رمضان 40ھ میں حضرت علیؓ کو ایک خارجی عبدالرحمن ابن ملجم نے اس وقت شدید زخمی کردیا جب وہ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ انھی زخموں کی تاب نہ لا کر 21 رمضان المبارک کو شہادت پائی۔

سیرتِ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بطور عالم

حضرت محمد مصطفی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا تھا کہ ”میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔“

واقعہ یہ ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ قرب کے سبب آپؓ نے سب سے زیادہ فیض حاصل کیا۔اسی لیے آپؓ دین اسلام کی روح کو سمجھتے تھے۔نہایت باصلاحیت وذہین تھے۔دین کے اصولوں کو حالات پر منطبق کرنے میں ممتاز تھے اسی لیے حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا ”علیؓ کی موجودگی میں کوئی اور فتویٰ نہ دیا کرے۔“ عبداللہ بن عباسؓ جو خود بھی بہت بڑے عالم وفقیہ تھے حضرت علیؓ سے متاثر تھے۔حضرت علیؓ حافظ قرآن تھے اور آپؓ کے استاد براہ راست نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تھے۔ہر سورۃ کا شان نزول معلوم تھا اور آپؓ اس کا صحیح مفہوم بھی واضح کرتے تھے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے قرب کی وجہ سے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ارشادات سننے کا زیادہ موقعہ ملا اس لیے احادیث کی کافی تعداد آپؓ سے مروی ہے۔حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں مفتی کا منصب آپؓ کے پاس تھا۔

تصوّف کے تمام سلسلے خواجہ حسنؒ بصری سے جا کر ملتے ہیں جو براہِ راست حضرت علیؓ سے فیض یاب ہوئے تھے۔تمام صوفیا آپؓ کو ابوالتصوف یعنی تصوف کا جدِ اعلیٰ مانتے ہیں۔

حضرت علیؓ کو فقہ واجتہاد میں جو فضیلت حاصل تھی،اسی کے سبب آپ کو فتویٰ دینے کا اختیار دیا گیا تھا۔حضرت علیؓ کا معروف قول ہے۔”دنیا مردار ہے جو اسے حاصل کرنا چاہے اس کو کتوں کی صحبت کے لیے تیار رہنا چاہیے“۔آپؓ کے حصہ میں مال غنیمت میں سے جو کثیر رقم آپؓ کے حصے میں آتی تھی آپؓ اسے خیرات کردیتے اور خود فاقہ کشی کی زندگی بسر کرتے۔آپؓ رات کو اللہ کے حضور کھڑے ہوتے اور دن کو عام طور پر روزہ رکھتے۔

حضرت علیؓ بیت المال سے صرف اتنا ہی لیتے جتنا گزارے کے لیے کافی تھا۔ ایک مرتبہ سردی میں ایک پھٹی پرانی چادر لیے کانپتے جا رہے تھے کہ کسی نے کہا امیر المومنین آپؓ کا اور آپؓ کے جسم کا بھی بیت المال پر حق ہے تو آپؓ نے فرمایا میں تمھارے حق کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شجاعت اور بہادری

حضرت علیؓ کی شخصیت کا دوسرا اہم پہلو آپؓ کی شجاعت ہے۔ آپؓ نے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زندگی میں شجاعت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور ''شیرِ خدا''، ''اسد اللہ'' کا خطاب حاصل کیا۔ مکی دور میں ہر نازک وقت میں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ رہے اور جب ضرورت پیش آئی آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا دفاع کیا۔

غزوۂ احد میں حضرت مصعب بن عمیرؓ کے شہید ہونے کے بعد لشکرِ اسلام کا علم (جھنڈا) آپؓ نے ہی سنبھالا تھا۔ جب مومنین کے پاؤں اُکھڑے تو چند جاں نثاروں نے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے گرد حلقہ بنا لیا۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے علاوہ حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔ یہ اصحاب حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو پہاڑ کے محفوظ مقام پر لے گئے اور آپؓ نے حضرت فاطمہؓ کے ساتھ مل کر حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زخم دھوئے۔

آپؓ یہودیوں کے خلاف تمام جنگوں میں شریک رہے تھے لیکن ان کا یادگار کارنامہ خیبر کی فتح کے موقع پر قلعہ قموص کے پہلوان سردار مرحب کا قتل ہے جو خیبر کا بادشاہ تھا۔ خود اس کے مقابلے پر آئے اور یہ اشعار پڑھے۔

ترجمہ: ''میں وہ شخص ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر (شیر) رکھا ہے۔ جنگل کے شیر کی طرح خوفناک، میں اپنے دشمن کو نہایت سرعت سے قتل کرتا ہوں۔''

اس کے بعد مرحب کے سر پر تلوار کا بھرپور وار کیا جو دشمن خدا کے سر اور جبڑے کو چیرتی ہوئی گردن تک جا پہنچی۔ مرحب کے قتل کی وجہ سے آپؓ کو فاتح خیبر کہا جاتا ہے۔

غزوۂ حنین میں آپؓ ان دس بارہ نفوس پاک میں سے تھے جو ثابت قدم رہے اور انھوں نے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حفاظت کی نیز آپؓ کی شجاعت اور تدبیر نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق اور عمر فاروقؓ کے ادوارِ خلافت میں دفاعی پالیسی کی تشکیل میں حضرت علیؓ کا کردار بہت نمایاں تھا۔

خوارج

خارجی زیادہ تر بنوتمیم اور بعض دیگر قبائل عرب اور ان کے عجمی حمایتی (موالی) تھے جن میں عدنانی عربوں کے ساتھ مفتوحہ قوموں کے لوگ بھی شامل ہو گئے کیونکہ وہ بھی عربوں کی حکومت کے دل سے خلاف تھے۔

حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کے خلاف تحریک میں بہت سے عناصر شامل تھے۔ ان کا باہمی اتحاد صرف ایک نکتہ پر تھا یعنی

حضرت عثمانؓ کی مخالفت ۔حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد انھوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اوران کی فوج میں شامل ہو گئے ۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں یہ حضرت علیؓ کے ساتھ تھے ۔ یہ لوگ دین اسلام کا صحیح شعور نہ رکھتے تھے ۔ اللہ کی توحید، رسالت اورآخرت پر ایمان تو لے آئے تھے لیکن اپنے نسلی تعصّبات اور قومی رجحانات پر ابھی تک قائم تھے۔

جن عقائد کا خوارج نے پرچار کیا ان میں سے اہم ترین حسب ذیل ہیں:

i- حَکَمْ صرف خدا کی ذات ہے اس کے علاوہ کسی انسان کو حَکَمْ ماننا شرک ہے۔

ii- گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر ہے اور جو اسلام قبول کرنے کے بعد کفر کرے وہ مرتد اور واجب القتل ہے،لہٰذا گناہ کبیرہ کے مرتکب قتل کیے جاسکتے ہیں۔

iii- حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی خلافت برحق تھی ۔حضرت عثمانؓ کا انتخاب بھی صحیح تھا لیکن خلافت سے دستبردار ہونے سے انکار کر کے انھوں نے کفر کیا،اس لیے وہ واجب القتل تھے،(نعوذ باللہ) اوران کا قتل برحق تھا۔

iv- حضرت علیؓ کا انتخاب صحیح تھا لیکن انھوں نے حَکَم مان کر کفر کیا،لہٰذا وہ بھی واجب القتل ہیں۔(نعوذ باللہ)

v- امیر معاویہؓ کا انتخاب بھی غلط تھا تاہم حَکَم مان کر وہ بھی مرتد قرار پائے اور واجب القتل ہیں۔(نعوذ باللہ)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت

جنگِ نہروان میں شکست کھانے کے بعد چند خارجی ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور انھوں نے یہ طے کیا کہ امت مسلمہ کے کام خراب ہونے کی وجہ تین اشخاص علیؓ،معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص ہیں ۔ اگر تینوں کو قتل کر دیا جائے تو امت مسلمہ پھر سے متحد ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ عبدالرحمن بن ملجم نے حضرت علیؓ کو برک بن عبداللہ نے امیر معاویہؓ کو اور عمرو بن بکر نے عمرو بن العاصؓ کو قتل کرنے کا ذمہ لیا اور یہ طے ہوا کہ تینوں ایک ہی دن مقررہ وقت پر ان تینوں کا خاتمہ کریں۔تینوں حملہ آور صبح کی نماز کے وقت مساجد میں منتظر رہے۔ابن ملجم حضرت علیؓ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔امیر معاویہؓ کے زخم کاری تھے۔عمرو بن العاصؓ کی بجائے خارجہ بن خذافہ شہید ہو گئے کیونکہ اس دن امامت کے لیے عمرو بن العاصؓ نہیں آئے تھے اس طرح خوارج نے حضرت علیؓ سے اپنی شکست کا انتقام لے لیا۔

حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت امام حسنؓ،حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ بتولؓ کے صاحبزادے اور رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے نواسے تھے۔حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلیفہ منتخب ہوئے ۔ امیر معاویہؓ کو جب حضرت علیؓ کی شہادت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے عراق پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ ایک لشکر جرار لے کر عراق پر حملہ کر دیا۔امام حسنؓ بھی چالیس ہزار فوج لے کر روانہ ہوئے اور قیسؓ بن سعد کو بارہ ہزار فوج کے ساتھ ہراول دستے کے طور پر روانہ کیا۔راستہ میں ایک جگہ اچانک یہ خبر مشہور ہو گئی کہ قیسؓ بن سعد کو شکست ہو گئی ہے۔اس پر عراقی فوج نے اپنی روایتی غداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود حضرت حسنؓ پر حملہ کر دیا۔آپؓ بڑی مشکل سے بچے۔آپؓ طبعاً صلح جُو تھے۔اس واقعہ سے عراقی

فوج کی وفاداریوں کی قلعی کھل گئی اور آپ ؓ نے صلح کرنے کا ارادہ کرلیا۔ جب حضرت امیر معاویہؓ کو اس ارادہ کا علم ہوا تو ایک سادہ کاغذ پر مہر لگا کر آپ ؓ کے پاس بھجوایا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ حضرت حسن ؓ جو شرائط بھی لکھیں وہ ان کو ماننے کے لیے تیار ہیں۔ حضرت حسنؓ نے جو شرائط لکھیں وہ یہ تھیں:

i- سب لوگوں کو امان دی جائے۔

ii- دارالجبرود کا خراج انھیں دیا جائے۔

iii- اہل عراق کو جان و مال کا تحفظ دیا جائے۔

iv- دو لاکھ درہم سالانہ دیے جائیں۔

v- وظائف کے معاملے میں بنو ہاشم کو بنوامیہ پر ترجیح دی جائے۔

اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے حقوق کے تحفظ کے بعد آپ ؓ نے اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا اور کل چھ مہینے کی خلافت کے بعد آپ ؓ دست بردار ہو کر مدینہ میں مقیم ہو گئے۔ آپ ؓ کی وفات کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ عام روایت ہے کہ اشعث بن قیس کندی کی بیٹی نے جو آپؓ کی بیوی تھی یزید کے اُکسانے پر آپ ؓ کو زہر دیا، تاہم آپ ؓ نے اس سلسلے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا اور کسی سے آپ ؓ کا قصاص نہ لیا گیا۔

مشقی سوالات

درج ذیل سوالات کے تفصیلی جواب تحریر کریں۔

i- جنگ جمل کی وجوہات اور نتائج تحریر کریں۔

ii- جنگِ صفین کیوں لڑی گئی اور حضرت علیؓ کو اس میں کیوں شکست ہوئی؟

iii- حضرت علیؓ کی شہادت کی وجوہات اور تفصیل لکھیں۔

iv- خوارج کا فرقہ کیوں اور کیسے وجود میں آیا اور اسلامی تاریخ میں اس کے کیا اثرات ہوئے۔

v- حضرت امام حسنؓ خلافت سے دستبردار کیوں ہوئے؟ بیان کریں۔

2- درج ذیل کے مختصر جواب دیں۔

i- حضرت علیؓ نے خلیفہ بننے کے بعد نئے عمال حکومت کیوں مقرر کرنا چاہے؟

ii- حضرت عائشہؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کا بدلہ لینے کا کیوں سوچا؟

iii- جنگِ جمل کا فیصلہ کس طرح حضرت علیؓ کے حق میں ہوا؟

iv- جنگِ جمل میں مصالحت کے بعد لڑائی دوبارہ کیوں شروع ہوئی؟

-v خوارج کون تھے؟

-vi فتح خیبر کے موقع پر حضرت علیؓ نے مرحب کا مقابلہ کرنے سے قبل کون سے اشعار پڑھے تھے؟

-vii خوارج نے جن عقائد کا پرچار کیا ان میں سے دو تحریر کریں؟

-viii حضرت علیؓ نے اپنی جانب سے ثالث کس کو مقرر کیا؟

-3 مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پر کریں۔

-i غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ نے .... کو قتل کیا۔

-ii حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی فوجیں .... کے میدان میں مقابل آئیں۔

-iii حضرت امیر معاویہؓ نے .... کے مشورے سے قرآن کے اوراق نیزوں پر کھڑے کروائے۔

-iv حضرت علیؓ نے مصر پر .... کو مقرر کیا تھا۔

-v حضرت علیؓ کو ایک خارجی .... نے شہید کر دیا۔

-vi حضرت علیؓ نے .... کے بادشاہ مرحب کو قتل کیا۔

-4 درج ذیل واقعات کے سن تحریر کریں:

-i حضرت علیؓ کی خلافت -ii جنگِ جمل -iii جنگِ صفین

باب
5

خلفائے راشدین کی خصوصیات

1- منتخب خلیفہ

خلافت راشدہ میں خلیفہ کے انتخاب کے لیے سرکاری دباؤ نہیں ڈالا جاتا تھا اور کسی شخص کو خلیفہ بنانے کے لیے تلواریں بے نیام نہیں ہوتی تھیں بلکہ عوام اپنی رضا ورغبت سے کسی شخص پر اعتماد کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کی تجویز انصار کے اجتماع میں پیش ہوئی اور مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں سبھی لوگوں نے آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت عمرؓ کا نام حضرت ابوبکرؓ نے کبار صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے تجویز کیا اور عام لوگوں سے اس انتخاب کی توثیق کرائی۔ حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے لیے ایک چھ رکنی کمیٹی بنائی گئی اور اس کے فیصلے کو عوام نے تسلیم کیا۔ حضرت علیؓ کے پاس جا کر صحابہؓ نے مجبور کیا تو انھوں نے عوام سے پوچھ کر خلافت سنبھالی۔ خلفائے راشدین میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو عوام کی منشا کے خلاف مسندِ خلافت پر متمکن ہوا ہو۔ ابوموسیٰ اشعریؓ نے خلافت راشدہ اور بادشاہت میں فرق اس طرح واضح فرمایا کہ:

''خلافت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے غلبہ حاصل کیا گیا ہو''۔

2- نمائندہ مجلسِ شوریٰ کا وجود

خلافت شوریٰ کے بغیر جائز نہیں ہے کیونکہ قرآن پاک نے ہدایت فرمائی ہے کہ مومنین کے مسائل باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔ خود حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں معزز صحابہ کرامؓ سے امورِ ریاست کے بارے میں مشورہ لیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے تمام اہم معاملات پر شوریٰ سے فیصلہ کروایا۔ اہل شوریٰ کو اپنی بات پوری آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ شوریٰ خلیفہ کی ذات پر بھی تنقید کر سکتی تھی اور عملاً اگر شوریٰ خلیفہ سے اختلاف کرے اور خلیفہ کے پاس قرآن وسنت سے ملنے والی واضح ہدایت موجود نہ ہو تو اسے شوریٰ کی رائے کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔

3- بیت المال کو عوام کا مال سمجھنا

شخصی حکومت میں بیت المال حکمران کا مال ہوتا ہے لیکن خلافت راشدہ کا نظام بیت المال کو عوام کی امانت قرار دیتا ہے۔ خلیفہ کا حق اس میں صرف اتنا تھا جتنا ایک یتیم کے وارث کو یتیم کے مال پر ہو سکتا ہے۔ خلیفہ صرف گزارہ الاؤنس لینے کا مجاز تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کا کوئی ذریعہ آمدن نہ ہو۔ حضرت ابوبکرؓ نے عمر بھر میں تقریباً 80 ہزار درہم بیت المال سے لیے تھے لیکن وفات کے وقت وصیت کی کہ میرے ترکے میں سے یہ رقم بیت المال میں دوبارہ جمع کرادی جائے۔ حضرت عمرؓ بھی محض گزارہ الاؤنس لیتے تھے اور وہ خلیفہ ہونے

کے باوجود جیسی درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت عثمانؓ اتنے مالدار تھے کہ انھیں بیت المال سے کچھ لینے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بیت المال کے بارے میں خلافت راشدہ اور بادشاہت کے طرزِ عمل کے فرق کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ کے بھائی عقیل نے جب بیت المال سے کچھ رقم مانگی تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ ''کیا تم چاہتے ہو کہ تمھارا بھائی مسلمانوں کا مال تمھیں دے کر جہنم میں جائے''۔

4- کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مطابق حکومت

خلافت راشدہ کسی شخص کی ذاتی حکومت نہ تھی اور نہ خلیفہ کی صوابدید کا کوئی زیادہ دخل حکومت میں ہوتا تھا، بلکہ خلیفہ اور اس کے عمال کا مقصد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مطابق مسلمانوں کے معاملات کو چلانا تھا۔ ظالم کے ظلم کو روکنا اور مظلوم کی داد رسی خلیفہ کا فرض منصبی تھا۔ اس مقصد کے لیے خلیفہ اور عوام کے درمیان پردے حائل نہیں ہونے دیے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جب دُرّہ لے کر بازاروں میں نکلتے اور لوگوں کے ناپ تول کی پڑتال کرتے تو کوئی شخص ان کی طرف دیکھ کر یہ اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ یہ خلیفۂ وقت ہیں۔ خلافت کے اس مقصد کو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے اپنی پہلی تقریر میں واضح کر دیا تھا اور حضرت علیؓ نے اپنے عمال کو جو خطوط لکھے ان میں بار بار ان کو اسی چیز کی طرف متوجہ کیا۔

5- قانون کی حاکمیت

خلافت راشدہ میں قانون کی حاکمیت کا تصوّر مکمل طور پر پایا جاتا تھا۔ قانون کی نظر میں سب مساوی تھے۔ خواہ وہ ذمی ہوں یا مسلمان، نیز عدلیہ آزاد تھی مثلاً ذمی کے قتل کے عوض مسلمان قاتل کو قتل ہی کی سزا ملتی تھی۔ خلیفہ وقت اور کسی ذمی کے درمیان بھی اگر کوئی جھگڑا پیدا ہو جاتا تو خلیفہ کو عدالت میں حاضر ہو کر فریق مخالف کے ساتھ قاضی کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا۔ حضرت علیؓ نے جب وہ خلیفہ تھے، اپنی زرہ حاصل کرنے کے لیے عدالت میں استغاثہ دائر کیا تو نصرانی کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوئے اور کافی ثبوت مہیا نہ کر سکنے کی وجہ سے آپؓ کا استغاثہ خارج کر دیا گیا۔

6- عدل و مُساوات

خلافت راشدہ میں عوام کو خلیفہ کے ہر کام میں تنقید کا حق حاصل تھا۔ وہ اسے مشورے دے سکتے تھے۔ اس سے سوالات پوچھ سکتے تھے۔ اسے غلط کام سے روک سکتے تھے۔ خلیفہ عوام سے الگ تھلگ نہیں رہتا تھا بلکہ پانچوں وقت مسجد میں ان کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ اس کے مکان پر کوئی دربار نہیں ہوتا تھا۔ وہ عام لوگوں کے اندر گھومتا پھرتا تھا۔ اس لیے ہر شخص کسی وقت بھی اس سے اپنی بات کہنے کا مجاز تھا۔ خلفا خود اپیل کرتے تھے کہ انھیں غلطی سے روکا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پہلی تقریر میں فرمایا تھا کہ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میرا ساتھ دو اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔ حضرت عمرؓ کو کئی مرتبہ تنقید کے نتیجے کے طور پر اپنی رائے بدلنی پڑی۔ حضرت عثمانؓ نے عمر بھر لوگوں کی تنقید سنی لیکن لوگوں کے حقوق غصب نہیں کیے۔ حضرت علیؓ نے خوارج تک کو اظہار رائے کی آزادی دی۔

7- فلاحی ریاست

خلافت راشدہ کے دور میں حکومت کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود تھا۔ خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا تھا کہ ''اگر دریائے دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی مر جائے تو اس کی ذمہ داری بھی سربراہ ریاست پر ہوگی۔''

وہ رات کو رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے چکر لگاتے ضرورت مند کو اناج پہنچاتے اور مصیبت زدہ کی مصیبت دور کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں دولت کی فراوانی کی وجہ سے زکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ حکومت آمد و رفت کو بہتر بنانے کے لیے راستے بنواتی، پانی مہیا کرنے کے لیے نہروں کا اہتمام کرتی، زراعت کی ترقی کے لیے اقدامات کرتی، تجارت کے فروغ کے لیے ضابطے بناتی اور تعلیم کے فروغ کے لیے اقدامات کیے جاتے۔ غرضیکہ عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے ہر قسم کی کوششیں کی جاتیں۔

8- اشاعت دین کا اہتمام

انسان کی سب سے بڑی ضرورت ''رُشد ہدایت'' ہے، اس لیے خلافت راشدہ میں دین کی اشاعت کو حکومت کے مقاصد میں اولیت حاصل تھی۔ مساجد کا قیام، مؤذنوں کا تقرر، ان کی تنخواہیں مقرر کرنا اور عوام کی دینی تعلیم کا بندوبست اسی سلسلے کے اقدامات تھے۔

9- اظہارِ رائے کی آزادی

خلافت راشدہ ایک دستوری حکومت تھی۔ عام لوگوں، قبائل اور اقلیتوں کے حقوق کے سلسلے میں میثاق مدینہ میں جو بنیادیں فراہم کی گئی تھیں، خلافت راشدہ میں برقرار رہیں۔ غیر مسلموں کو ''ذمی'' قرار دے کر ان کے حقوق کا باقاعدہ اعلان کیا گیا، اور ان کو سماجی، معاشی اور مذہبی آزادی دی گئی۔ مسلم عوام کے حقوق کا بھی تحفظ کیا گیا۔ جب حضرت عمروؓ بن العاص نے کسی شخص کو ناحق سزا دی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''عمرو تم نے ان کو کب سے غلام بنایا ہے۔ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا''۔ حقوق انسانی میں سے ایک اہم حق اظہار رائے کی آزادی کا بھی ہے جس کا احترام خلفائے راشدین کیا کرتے تھے لیکن اسی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عبداللہ بن سبا نے حضرت عثمانؓ کے خلاف سازش کی اور خوارج نے حضرت علیؓ کے خلاف پروپیگنڈہ مہم چلائی۔ خلافت راشدہ کے بعد کے ادوار میں حکومت کے خلاف اظہار رائے کی اتنی آزادی نہ تھی۔

10- عصبیت و تنگ نظری سے پاک حکومت

خلافت راشدہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں فیصلے قبائلی عصبیتوں کی بنیاد پر نہیں کیے گئے بلکہ جن لوگوں نے اس عصبیت کو بھڑکانے کی کوشش کی انھیں ناکامی ہوئی مثلاً بعض انصاری صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے بعد خلافت کا فیصلہ قبائلی بنیاد پر طے کرنے کی کوشش کی تو عامۃ المسلمین نے حضرت ابوبکرؓ کو خدمات اسلام اور ذاتی بلندی کی بنا پر منتخب کر لیا۔

ابوسفیان نے قبائلی بنیادوں پر حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ کے خلاف بھڑکانا چاہا تو حضرت علیؓ نے سخت جواب دیا۔

11- مذہبی آزادی

خلافت راشدہ میں تمام مذاہب کو آزادی حاصل تھی۔ ذمی حسب منشا پوری آزادی کے ساتھ اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرتے۔ بہت سے شہر فتح کرتے ہوئے اسلامی فوج کے جرنیلوں نے جو مذہبی حقوق ذمیوں کو دیے اس کی مثال آج بھی کم ملتی ہے۔

مشقی سوالات

1۔ درج ذیل سوالات کے تفصیلی جواب تحریر کریں۔

i- خلافت راشدہ کی خصوصیات مختصراً بیان کریں۔

ii- خلفائے راشدین نے شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو زندہ رکھنے میں جو کردار ادا کیا۔ بیان کریں۔

2- غلط یا صحیح کی نشاندہی کریں۔

i- خلفائے راشدین کا دور جمہوری دور تھا۔

ii- خلافتِ راشدہ میں کسی شخص کو مشورہ دینے کی اجازت نہ تھی۔

iii- انصاف حاصل کرنے کے لیے خلیفہ کو بھی قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔

iv- خلفائے راشدین نے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطابق اشاعتِ دین کے لیے کوئی کام نہ کیا۔

3- خالی جگہ پر کریں۔

i- خلیفہ وقت کے سامنے ہر..................کو اپنا مسئلہ بیان کرنے کا حق حاصل تھا۔

ii- خلفاءِ راشدین نے شریعت..................کو زندہ رکھا۔

iii- خلافت میں مجلسِ...........بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔

iv- خلافتِ راشدہ..................سے پاک حکومت کی۔

باب 6

عہدِ بنُواُمیّہ

حضرت امیر معاویہؓ کا دور (40ھ تا 60ھ بمطابق 661ء تا 680ء)

حضرت امیر معاویہؓ ابوسفیان کے صاحبزادے تھے جو قریش مکہ کا وہ مشہور سردار تھا جس نے مسلسل کئی سال تک مدینہ و مکہ کی باہمی آویزش میں قریش مکہ کی قیادت کی لیکن فتح مکہ کے موقعہ پر اسلام قبول کیا۔ امیر معاویہؓ بھی اپنے باپ کے ساتھ ہی مسلمان ہوئے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے آپؓ کو کاتب وحی بھی مقرر کیا۔ آپؓ کے سیاسی کردار کا آغاز حضرت عمرؓ کے عہد سے ہوتا ہے جب ان کو دمشق کا گورنر مقرر کیا گیا۔ بعد میں حضرت عثمانؓ نے آپؓ کو پورے صوبہ شام کا گورنر بنا دیا۔

حضرت امام حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری نے امیر معاویہؓ کو مملکت اسلامیہ کا واحد فرمانروا بنا دیا۔ امیر معاویہؓ بن ابی سفیان اموی خلافت کے بانی کی حیثیت سے تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

سلسلۂ نسب

آپؓ قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنی امیہ میں سے تھے اور پانچویں پشت پر آپؓ کا نسب رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے مل جاتا ہے۔ آپؓ کا سلسلہ نسب یہ ہے:

حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان، بن حرب، بن امیہ، بن عبدشمس بن عبدمناف

اسلامی خدمات

فتح مکہ کے موقع پر آپؓ کی عمر پچیس سال تھی جب آپؓ اپنے خاندان کے ساتھ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے دست مبارک پر مشرف با اسلام ہوئے۔ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ان کی قابلیت اور پڑھے لکھے ہونے کے باعث کاتبانِ وحی میں شامل کر لیا۔ قیساریہ کے معرکے میں آپؓ نے اپنے جوہر شمشیر دکھائے اور حضرت عمرؓ کی خوشنودی حاصل کر کے اُردن کے حاکم مقرر ہوئے۔

سیاسی عروج

ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان جو دمشق کے والی تھے، وفات پائی تو امیر معاویہؓ شام کی حکومت کے والی بنائے گئے اور حضرت عثمانؓ کے عہد تک اس عہدہ پر قائم رہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت 35ھ کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم نہ کی اور قصاص عثمان کا مطالبہ کر کے حضرت علیؓ سے مقابلہ کیا۔

میدان صفین میں حضرت علیؓ کی فوج امیر معاویہؓ کے لشکر پر غالب آ رہی تھی، ثالث بنائے جانے کے اصول پر صلح ہوئی اور

ثالثوں نے حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ دونوں کو خلافت سے برطرف کر کے اس مسئلہ کو امت کی رائے پر ملتوی کیا۔ اہل شام نے حضرت امیر معاویہؓ کو اور اہلِ عراق نے حضرت علیؓ کو خلیفہ تسلیم کیا اور اس طرح مسلمانوں کے اندر جنگ وجدال کی بنیاد پڑی۔ تا آنکہ 40ھ کے آغاز میں حضرت علیؓ کی شہادت واقع ہوئی اور ان کے فرزندِ اکبر حضرت امام حسنؓ حقِ خلافت سے دستبردار ہو گئے اور یوں اموی دورِ خلافت کا آغاز ہوا۔

حضرت امیر معاویہؓ نے انتظام سلطنت کو بہتر بنانے کے لیے بہت سی اصلاحات کیں۔ ان کے قابل گورنر زیاد نے پولیس کا محکمہ قائم کیا جس کو الشرطہ کہا جاتا تھا۔ اس میں کم وبیش چالیس ہزار افراد بھرتی کیے گئے۔ قیامِ امن کی غرض سے مشتبہ افراد کے نام ایک رجسٹر میں لکھے جاتے تھے اور ان پر کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ محکمہ ڈاک (دیوان البرید) کو دوبارہ قائم کیا گیا تاکہ تمام علاقوں سے بروقت اطلاعات خلیفہ کو ملتی رہیں۔ اس مقصد کے لیے مختلف شہروں میں تیز گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امیر معاویہؓ کو محسوس ہوا کہ ان کے احکام کو مناسب انداز میں نہیں پہنچایا جاتا چنانچہ آپؓ نے ایک الگ شعبہ قائم کیا جس کو دیوان الخاتم کہتے تھے۔ یہ شعبہ شاہی فرامین پر مہر لگاتا تھا اور ان کی نقل ریکارڈ میں رکھتا تھا تاکہ اگر کسی حکم میں کوئی اضافہ یا کمی کی جائے تو معلوم ہو جائے۔

حضرت امیر معاویہؓ نے فوج کا نظام بھی بہتر بنایا۔ فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ سرمائی فوج سردیوں میں لڑتی تھی اور گرمائی فوج گرمیوں میں۔ امیر معاویہؓ کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ بحری فوج کا قیام ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے مفتوحہ علاقے پر مضبوط کنٹرول قائم رکھنے کے لیے فوجی چھاؤنیاں بھی بنائیں۔ آپؓ کے زمانے میں بعض نئے آلات حرب بھی ایجاد کیے گئے۔

یزید بن معاویہ

حضرت امیر معاویہؓ کے مقابلے میں ان کا جانشین یزید شراب کا عادی تھا، اس لیے حضرت امام حسینؓ کسی فاسق و فاجر کو امیر المومنین تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

سانحۂ کربلا

یزید نے تخت نشین ہونے کے بعد ولید بن عقبہ حاکم مدینہ کو لکھا کہ حسینؓ بن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے زبردستی بیعت لی جائے۔ ولید نیک آدمی تھے انھوں نے جبر نہ کیا لیکن مروان بن الحکم نے سختی کرنے کا شدید مطالبہ کیا تھا، اس لیے حضرت امام حسینؓ کے لیے مدینہ سے باہر نکل کر مقابلے پر آئے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حرم کی حدود میں پناہ لی لیکن حضرت امام حسینؓ کوفہ روانہ ہوئے۔

حضرت امام حسینؓ اس حد تک تو کوئی خطرہ مول لیے بغیر جا سکتے تھے کہ حرم کی حدود میں پناہ لیں اور جنگ وجدل کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اہل کوفہ نے آپؓ کو دعوت دی کہ اگر آپؓ کوفہ آئیں گے تو ہم آپؓ کا ساتھ دیں گے اور اس طرح صحیح اسلامی نظام قائم کرنے اور باطل کا سدباب کرنے کا فریضہ پورا ہو سکے گا۔ حضرت امام حسینؓ اپنے جذبۂ ایمان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ قرابت داری کی

وجہ سے یہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ حق کو دنیا میں قائم کریں اور باطل کے خلاف لڑیں اس وجہ سے آپؓ نے یہ دعوت قبول فرمالی۔

حضرت امام حسینؓ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو تحقیق احوال کے لیے کوفہ بھیجا۔ آپؓ وہاں جا کر مختار بن ابوعبیدہ کے ہاں ٹھہرے، پہلے ہی دن بارہ ہزار کوفیوں نے جن میں شیوخ اور رؤسائے کوفہ بھی شامل تھے مسلم بن عقیلؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، ان حالات کی اطلاع حضرت امام حسینؓ کو کردی گئی۔ مسلم بن عقیلؓ کا خط ملتے ہی حضرت امام حسینؓ نے کوفہ کی طرف روانگی کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ 8 ذوالحجہ کو آپ بمعہ اہل وعیال مکہ سے روانہ ہوئے۔

یزید کو جب کوفہ میں مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعت کی اطلاع ملی تو اس نے عبیداللہ بن زیاد کو حاکم کوفہ مقرر کرکے بھیجا۔ یہ شخص نہایت چالاک اور سخت گیر تھا۔ اس نے اچانک کوفہ پہنچ کر اہل کوفہ کو ڈرا دھمکا کر بنوامیہ کی حمایت پر آمادہ کرلیا۔ مسلم بن عقیلؓ کی حمایت میں صرف تیس 30 آدمیوں کی ایک جماعت رہ گئی چنانچہ محمد بن اشعث نے آپؓ کو گرفتار کرلیا اور عبیداللہ نے آپؓ کو معہ آپؓ کے ساتھیوں کے شہید کروادیا۔

ابن اشعث نے مسلم بن عقیلؓ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حضرت امام حسینؓ کو صحیح حالات سے باخبر کردے گا، اس طرح امام حسینؓ کو راستہ ہی میں معلوم ہوگیا کہ کوفہ کے حالات بدل چکے ہیں لیکن واپسی کی بجائے آپؓ نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ جب آپؓ کربلا کے میدان میں پہنچے تو ایک ہزار کوفیوں نے حربن یزید تمیمی کی قیادت میں آگے بڑھنے سے روک دیا۔

عبیداللہ بن زیاد نے چار ہزار مزید فوج عمر بن سعد اور شمر ذوالجوشن کی قیادت میں بھیجی۔ عمر بن سعد نے مصالحت کی کوشش کی اور امام حسینؓ سے بالمشافہ گفتگو کی۔ حضرت امام حسینؓ نے تین شرائط پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک تسلیم کی جائے۔

- i- مجھے واپس جانے کی اجازت دی جائے
- ii- مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کرنے دیا جائے۔
- iii- مجھے کسی سرحد پر بھیج دیا جائے تاکہ میں جہاد میں مصروف ہوجاؤں۔

عمر بن سعد نے یہ شرائط لکھ کر ابن زیاد کے پاس بھیجیں۔ شمر ذوالجوشن کے مشورے سے اس نے ان شرائط میں سے کسی ایک کو بھی ماننے سے انکار کردیا اور لکھ کر بھیجا کہ امام حسینؓ اپنے آپؓ کو ہمارے حوالے کردیں تو بہتر، ورنہ جنگ کے علاوہ کوئی چارا نہیں۔ اس جواب کے موصول ہونے پر آپؓ نے اپنی فوج سے مخاطب ہوکر کہا کہ دشمن صرف ہماری جان چاہتا ہے تم میں سے اگر کوئی جان بچانا چاہے تو چلا جائے لیکن جان نثاروں نے آپؓ کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد آپؓ نے کوفیوں کو مخاطب کرکے ان کے وعدے یاد دلائے اور انھیں احساس دلانے کی کوشش کی کہ ان کے عزائم کتنے ناپاک ہیں لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ حربن یزید اپنے لشکر کو چھوڑ کر آپؓ کے ساتھ آملا۔ 10 محرم الحرام تک آپؓ کے خاندان کے سب احباب شہید ہوچکے تھے بالآخر تن تنہا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا اور شمر اور اس کے ساتھیوں نے اپنی ناپاک تلواروں سے آپؓ کو زندہ وجاوید بنادیا۔

شہادت حضرت امام حسینؓ ایک معمولی واقعہ نہیں بلکہ حق وباطل کی وہ جدوجہد ہے جو تاقیامت لوگوں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ یہ

واقعہ مسلمانوں کے لیے یہ سبق رکھتا ہے کہ سر کٹایا تو جا سکتا ہے لیکن باطل کے سامنے جھکایا نہیں جا سکتا۔

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی خبر سنتے ہی مکہ و مدینہ میں یزید کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ اہل مدینہ نے امام زین العابدینؒ کی بیعت کر لی۔

سانحۂ کربلا کے نتائج

واقعہ حرّہ

شہادت حسینؓ کی خبر جب سرزمین حجاز میں پہنچی تو کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اس سانحہ پر اشکبار نہ ہو۔ لہٰذا حجاز میں فوری طور پر انقلاب برپا ہو گیا۔ اہل مدینہ نے اموی حکام کو صوبہ سے نکال دیا اور عبداللہ بن زبیرؓ کی بیعت کر لی۔ یزید نے ولید بن عقبہ کی ماتحتی میں شامیوں کی فوج روانہ کی۔ اس فوج میں عیسائی کثیر تعداد میں شامل تھے۔ جب اہل مدینہ نے اطاعت قبول نہ کی تو ولید بن عقبہ نے شہر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اہل مدینہ اگرچہ بڑی بے جگری سے لڑے لیکن شامی افواج کے سامنے کوئی پیش نہ گئی۔ اس جنگ میں بڑے بڑے اکابر مدینہ شہید ہوئے جن میں فضل بن عباس اور عبداللہ بن حنظلہؓ قابلِ ذکر ہیں۔ شہر پر قبضہ کے بعد مدینۃ الرسول صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم میں تین دن تک شامی فوجیوں کے مسلسل قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ تاریخ اسلام میں یہ واقعہ بہت اہم ہے اور سانحہ کربلا کے بعد یزید کا دوسرا بڑا سیاہ کارنامہ ہے۔

واقعہ کربلا کی اہمیت

اسلامی تاریخ کو کسی اور واقعہ نے اس قدر اور اس طرح متاثر نہیں کیا جیسے سانحہ کربلا نے کیا۔ آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم اور خلفائے راشدینؓ نے جو اسلامی حکومت قائم کی۔ اس کی بنیاد انسانی حاکمیت کی بجائے اللہ تعالٰی کی حاکمیت کے اصول پر رکھی گئی تھی۔ اس نظام کی روح شورائیت میں پنہاں تھی۔ اسلامی تعلیمات کا بنیادی مقصد بنی نوع انسان کو شخصی غلامی سے نکال کر خدا پرستی، حریت فکر، انسان دوستی، مساوات اور اخوت ومحبت کا درس دینا تھا۔ خلفائے راشدین کے دور تک اسلامی حکومت کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ یزید کی حکومت چونکہ ان اصولوں سے ہٹ کر شخصی بادشاہت کے تصور پر قائم کی گئی تھی، لہٰذا جمہور مسلمان اس تبدیلی کو اسلامی نظام شریعت پر ایک ضرب کاری سمجھتے تھے۔ اس لیے حضرت امام حسینؓ محض ان اسلامی اصولوں اور قدروں کی بقا و بحالی کے لیے میدان عمل میں اترے۔ راہِ حق پر چلنے والوں پر جو کچھ میدان کربلا میں گزری وہ جور و جفا، بے رحمی اور استبداد کی بدترین مثال ہے۔ یہ تصور ہی کہ اسلام کے نام لیواؤں پر یہ ظلم وتعدّی خود ان لوگوں نے کی جو خود کو مسلمان کہتے تھے بڑا روح فرسا ہے۔ مزید یہ کہ حضرت امام حسینؓ کا جو تعلق آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم سے تھا اسے بھی نگاہ میں نہ رکھا۔

نواسہ رسول صلّی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلّم کو میدانِ کربلا میں بھوکا پیاسا رکھ کر جس بے دردی سے شہید کر کے ان کے جسم اور سر کی بے حرمتی کی گئی، یہ اخلاقی لحاظ سے بھی تاریخ اسلام میں اولین اور بدترین مثال ہے۔ اس جرم کی سنگینی میں مزید اضافہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ

امام حسینؓ نے آخری لمحات میں جو انتہائی معقول تجاویز پیش کیں انھیں سرے سے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا گیا۔ اس سے یزید کے اعمال کی آمرانہ ذہنیت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ جب شخصی اور ذاتی مصالح، ملی، اخلاقی اور مذہبی مصلحتوں پر حاوی ہو جاتے ہیں تو انسان درندگی کی بدترین مثالیں بھی پیش کرنے پر قادر ہے۔ لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں سانحہ کربلا کا جائزہ لیا جائے تو یہ واقعہ اسلام کے نام پر سیاہ دھبہ ہے کیونکہ اس سے اسلامی نظامِ حکومت میں ایسی خرابی کا آغاز ہوا جس کے اثرات آج تک ہم محسوس کر رہے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ (64ھ تا 73ھ بمطابق 685ء تا 695ء)

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے پھوپھی زاد بھائی زبیر بن العوام کے بیٹے تھے۔ آپؓ کی والدہ کا نام اسماءؓ تھا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی تھیں۔ اس لحاظ سے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے آپؓ بہت قریبی رشتہ دار تھے۔ آپؓ کی ولادت ہجرتِ نبوی کے دوسرے سال اس وقت ہوئی جب یہود نے مشہور کر رکھا تھا کہ یہود کا خدا مسلمانوں سے ناراض ہے، اس لیے ان کے ہاں اولادِ نرینہ نہیں ہوتی چنانچہ آپؓ کی ولادت مدینہ کے مسلمانوں کے لیے نہایت مسرت کا باعث بنی۔ صاحبِ عزیمت والدین کا یہ بیٹا نہایت بہادر اور عالی حوصلہ تھا اور بچپن ہی سے تقویٰ، شجاعت اور تدبر میں ممتاز تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت عبد اللہ بن زبیرؓ ان نوجوانوں میں سے ایک تھے جو آخر دم تک خلیفہ کے دروازے پر پہرہ دیتے رہے۔

یزید کی تخت نشینی کے بعد ولید بن عقبہ حاکمِ مدینہ نے جب آپؓ سے بیعت لینی چاہی تو آپؓ ایک رات کی مہلت لے کر مکہ چلے گئے اور حدودِ حرم میں مقیم ہو گئے۔ حضرت امام حسینؓ کو بھی آپؓ نے یہی مشورہ دیا کہ وہ کوفہ جانے کی بجائے مکہ ہی میں مقیم رہیں لیکن وہ نہ مانے۔ سانحہ کربلا کے بعد آپؓ نے یزید کی غیر شرعی حکومت کے خلاف آواز اٹھائی اور قصاصِ حسینؓ کی دعوت بلند کر کے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ تمام اہلِ حجاز نے آپ کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔

یزید نے اس کے بعد حصین بن نمیر کو ایک فوج دے کر مکہ پر قبضہ کے لیے روانہ کیا۔ ابن نمیر نے شہر کا محاصرہ کر کے شہر پر پتھراؤ کیا لیکن ابھی محاصرہ جاری ہی تھا کہ یزید کی موت کی خبر پہنچ گئی۔ یزید کی موت کے بعد تمام علاقوں نے یکے بعد دیگرے عبد اللہ بن زبیرؓ کی خلافت کو قبول کرنا شروع کر دیا، حجاز و عراق کے علاوہ مصر نے بھی آپؓ کو خلیفہ مان لیا۔

مشہور اموی سردار مروان بن الحکم اس وقت مدینہ میں موجود تھا اور عبد اللہ بن زبیرؓ کی بیعت کرنے کو تیار تھا لیکن ابن زبیر کو امویوں سے شدید نفرت ہو گئی تھی اس لیے آپؓ نے اس سے بیعت لینے کی بجائے اسے مدینہ سے باہر نکال دیا۔ یہی مروان شام پہنچ کر حکومت پر قابض ہو گیا اور اموی حکومت کے استحکام کا باعث بنا۔

عبد الملک بن مروان نے عبد اللہ بن زبیرؓ کی قوت پر آخری چوٹ لگانے کے لیے حجاج بن یوسف کو مکہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تو اپنی شہادت سے تھوڑی دیر قبل حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اپنی والدہ اسماءؓ بنت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشورہ طلب کیا کہ کیا انھیں ہتھیار ڈال دینے چاہییں؟ بہادر ماں نے جواب دیا کہ "اگر تم حق کے لیے باطل سے برسرِ پیکار تھے تو اتنے انسانوں کو مروانے کے بعد ہتھیار ڈالنا بے معنی ہے۔ تمھیں دنیا میں کب تک رہنا ہے۔ حق پر جان دینا اس دنیا کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جاؤ اور راہِ حق پر

اپنی جان قربان کردو'۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اپنے بہادر جان نثاروں کے ساتھ شہر سے باہر آئے اور میدان جنگ ہی میں شہید ہوئے۔ حجاج نے آپؓ کی نعش کو تین دن تک پھانسی پر لٹکائے رکھا۔

عبدالملک بن مروان (65ھ تا 86ھ بمطابق 685ء تا 705ء)

عبدالملک بن مروان نے جب مسندِ خلافت سنبھالی تو خاندان بنوامیہ ہر طرف سے مشکلات کے نرغے میں گھرے ہوئے تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تمام دشمنوں کو نیچا دکھایا۔ ملک کے اندر اور باہر اموی قوت کا لوہا منوایا۔ اس کے جانشینوں کو ایک مضبوط حکومت وراثت میں ملی اور اسی لیے وہ اس میں توسیع کے قابل ہو سکے۔ اس لیے بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ اموی سلطنت کا اصل بانی عبدالملک بن مروان تھا۔

عبداللہ بن زبیرؓ کی مقبولیت اور حرم پر قبضہ کی وجہ سے ان کی پوزیشن کافی مضبوط تھی۔ ان کے بھائی مصعبؓ بن زبیر عراق پر قابض تھے۔ انھوں نے مختار ثقفی کی طاقت بھی توڑ دی تھی۔ عبدالملک کے لیے یہ مسئلہ بنیادی حیثیت کا حامل تھا، اس لیے اس نے 690ء میں خود عراق پر لشکر کشی کی۔ وہ اہل عراق کی کمزوریوں سے خوب واقف تھا اس لیے اس نے جاتے ہی مال ومتاع کا لالچ دے کر مصعبؓ کی فوج کے اکثر حصے کو توڑ لیا۔ اس کے باوجود گھمسان کا رن پڑا، مصعبؓ اور ان کا بیٹا عیسیٰ نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور عراق پر عبدالملک کا قبضہ ہو گیا۔

عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو فوج دے کر مکہ پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا۔ حجاج نے جاتے ہی مکہ کا محاصرہ کر لیا اور سلسلہ رسد منقطع کر دیا۔ شہر میں قحط پڑ گیا اس لیے لوگ شہر سے بھاگ بھاگ کر حجاج کے پاس پناہ لینے لگے۔ اس کے باوجود عبداللہ بن زبیرؓ کے عزم و استقلال میں فرق نہ آیا۔ اس پر حجاج نے شہر پر پتھراؤ شروع کر دیا جس کی وجہ سے کعبہ کی عمارت کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ جب عبداللہ بن زبیرؓ نے دیکھا کہ شامی حرم کا احترام بھی نہیں کرتے تو وہ اپنے جان نثاروں سمیت شہر سے باہر نکلے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ مکہ فتح ہو گیا اور عبدالملک بن مروان نے اسلامی سلطنت کو ایک دفعہ پھر متحد کر لیا۔

خوارج کی موجودگی میں امن وسکون قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ عام مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھاتے تھے۔ ان میں سے سب سے زیادہ خطرناک بغاوت شبیب خارجی نے کی۔ ایک نہایت پارسا بزرگ صالح تمیمی جنھوں نے اموی مظالم کے انسداد کا علم بلند کیا تھا، بھی اس کی امداد پر آمادہ ہو گئے۔ حجاج خود مقابلے پر آیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد شبیب کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ شبیب دریا عبور کرتے ہوئے دریا میں ڈوب گیا۔ شبیب کی موت سے خوارج کی قوت ٹوٹ گئی۔

عبدالملک نے نہ صرف داخلی و خارجی مشکلات پر قابو پایا بلکہ بہت سی اصلاحات بھی کیں اور اموی خلافت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا۔ آپؒ کی بڑی بڑی اصلاحات درج ذیل ہیں۔

- سب سے اہم عربی زبان کی ترویج ہے۔ عربی کو سرکاری زبان قرار دیا اور پورے ملک میں ایک زبان استعمال ہونے لگی۔

- زمانۂ جاہلیت میں عرب میں نہ کوئی مرکزی حکومت تھی اور نہ ہی عربوں کا اپنا سکہ موجود تھا۔ پورے ملک میں ایک ہی سکہ رائج ہونے سے تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔
- اسلام نے مفتوحہ اقوام کے دلوں کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ حجاج نے خلیفہ سے اجازت لے کر قرآن پر اعراب لگوا دیے۔ اس طرح قرآن مجید میں تحریف کا امکان ختم ہو گیا اور نومسلموں کو اسے پڑھنے میں سہولت ہوگئی۔
- وسیع وعریض اموی سلطنت میں خود عرب فوجی سردار اور نومفتوحہ علاقے اکثر بغاوت کرتے رہتے تھے اس لیے پورے ملک کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے عبدالملک نے دیوان البرید قائم کیا۔
- حجاج بن یوسف اور عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلے میں خانہ کعبہ کی عمارت کو بھی کافی نقصان پہنچا تھا اس لیے عبدالملک نے اس نقصان کی تلافی کے لیے خانہ کعبہ کو نئے سرے سے تعمیر کروایا۔ اس کی عمارت میں توسیع کروائی اور اس کی شان وشوکت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔
- عبدالملک کے زمانے میں وادیٔ مکہ میں ایک زبردست سیلاب آیا جس سے اہل مکہ کو کافی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ عبدالملک نے سیلاب کی مستقل روک تھام کے لیے اقدامات کیے تاکہ وادیٔ مکہ میں سیلاب کا پانی داخل نہ ہو سکے

ولید بن عبدالملک - اموی دور کا سنہری زمانہ

(86ھ تا 96ھ بمطابق 705ء تا 715ء)

ولید بن عبدالملک کا زمانہ امن وامان، عظیم فتوحات اور تعمیراتی سرگرمیوں کے سبب اموی دورِ حکومت کا سنہری زمانہ قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں وسط ایشیا کی فتوحات، مسلمہ بن عبدالملک کی رومیوں کے خلاف مہمات، سندھ کی فتح، سپین کی فتح جیسے شاندار کارنامے سرانجام دیے گئے۔

اس کے علاوہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں تقریباً نصف صدی کے انتشار و بدامنی کے بعد امن وامان قائم ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کو امن کے قیام کے لیے نہایت سخت رویہ اختیار کرنا پڑا لیکن حجاج بن یوسف جیسے سخت وجابر گورنر نے خوارج تک کو اپنی سرگرمیاں بند کرنے پر مجبور کر دیا اور عوام نے سکھ کا سانس لیا۔

ولید بن عبدالملک نے کتاب اللہ اور احادیث مبارکہ کے قدردان ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ قرآن پاک حفظ کرنے والے لوگوں کو انعامات دیتا تھا۔ بعض اوقات قرآن پڑھنے سے غفلت برتنے پر سزا دیتا تھا۔ اس کے عہد میں مدینہ کے گورنر عمر بن عبدالعزیزؒ تھے جن کی علم دوستی اور نیکی بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی خصوصی توجہ سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شہر دینی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ مدینہ میں احادیث جمع کرنے میں خصوصی دلچسپی لی جاتی تھی۔

ولید بن عبدالملک نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو جو اس وقت مدینہ کے گورنر تھے ہدایت کی کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو وسیع کرنے کے لیے تمام ملحقہ مکانات خرید کر مسجد کا رقبہ وسیع کر دیا جائے۔ ولید کے کہنے پر قیصر روم نے بھی مسجد نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تعمیر کے لیے سامان بھیجا۔

ولید بن عبدالملک کا ایک لازوال کارنامہ دمشق کی جامع مسجد کی تعمیر ہے۔ اس مسجد کی تعمیر میں ہندوستان، ایران، افریقہ اور ایران کے معماروں نے بھی حصہ لیا۔ کئی ملکوں سے تعمیر کا سامان منگوایا گیا۔ ستون سنگ مرمر اور سنگ سماق کے بنے ہوئے تھے۔ سونے اور چاندی کا فراخ دلانہ استعمال کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے چاندی اور سونا قبرص سے منگوایا گیا جو اٹھارہ جہازوں پر لاد کر آیا۔ بارہ ہزار مزدور اور کاریگر اس کی تعمیر میں 9 سال تک مصروف رہے۔ ستونوں پر نقش ونگار اور محراب میں بیش قیمت جواہرات نے اس عمارت کی عظمت کو دوبالا کر دیا اور مسجد دمشق دنیا کے عجائبات میں شمار ہونے لگی۔

ولید بن عبدالملک کے دور میں تعمیرات کا کام صرف مذکورہ بالا دو مساجد تک ہی محدود نہ رہا بلکہ سلطنت کے طول وعرض میں جہاں کہیں مسجد کی ضرورت محسوس کی گئی اسے تعمیر کیا گیا اور جہاں پرانی مساجد تھیں ان کی مرمت اور دیکھ بھال کا کام کیا گیا۔ سڑکوں کی تعمیر نو، سنگ میل نصب کرنا اور سرکاری طعام خانے اور سرائیں بنانا ایسے کام تھے جن کو عوام نے پسند کیا۔ ناداروں، محتاجوں اور بے روزگاروں کے لیے وظائف اور مفت کھانے کا انتظام نچلے طبقے کے لیے باعث اطمینان تھا اور عملاً ملک سے گداگری ختم ہوگئی۔

الغرض ولید بن عبدالملک نے نہ صرف ملک کی حدود وسیع کیں بلکہ اپنے حسن انتظام سے اس ریاست کو فی الواقعہ رفاہی ریاست میں تبدیل کر دیا اس لیے اس عہد کو اموی دور کا سنہری زمانہ کہا جاتا ہے۔

سلیمان بن عبدالملک (96ھ تا 99ھ بمطابق 715ء تا 717ء)

سلیمان بن عبدالملک، ولید بن عبدالملک کا بھائی تھا۔ عبدالملک نے اپنی زندگی ہی میں ولید کے بعد سلیمان کو ولی عہد نامزد کر دیا تھا تاہم ولید نے اپنی زندگی میں کئی بار یہ کوشش کی کہ سلیمان کو ولی عہدی سے خارج کر کے اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر کرے لیکن حجاج بن یوسف کی پرزور حمایت کے باوجود اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔ چنانچہ 715ء میں ولید کی وفات کے بعد سلیمان مسندِ خلافت پر بیٹھا۔

سلیمان نے اقتدار سنبھالتے ہی حجاج کے مظالم کے خاتمے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ عراق کی جیلوں کے دوازے کھول دیے گئے۔ جن لوگوں کو حجاج کے ہاتھ سے نقصان پہنچا تھا ان کو مالی امداد دی گئی اور حجاج کے مقرر کردہ تمام عمال معزول کر دیے گئے۔

اگرچہ سلیمان کا عہد حکومت بہت مختصر تھا اور اس میں بھی قبائلی تعصّبات کی وجہ سے کافی کمزوری پیدا ہوگئی تھی۔ تاہم یزید بن مہلب نے جو قتیبہ کے بعد حاکم خراسان بنایا گیا تھا۔ طبرستان اور جرجان کے علاقوں پر فوج کشی کی۔ ابن مہلب غلطی سے پہاڑی علاقہ میں گھر گیا اور اس سے اسلامی لشکر کو کافی جانی نقصان ہوا تاہم اُس نے حاکمِ طبرستان کو صلح پر مجبور کر دیا اور جرجان میں داخل ہوکر وہاں کے باغیوں کا استیصال کیا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی پیش گوئی تھی کہ قسطنطنیہ کا فاتح ایک ایسا شخص ہوگا جس کا نام ایک پیغمبر کے نام پر ہوگا۔ چنانچہ

سلیمان نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کرلیا۔اس مقصد کے لیے روم کے ایشیائی علاقے کے گورنر لیون (Leon) سے ساز باز کی گئی اور مسلمہ بن عبدالملک کو ایک فوج کے ساتھ خشکی کے راستے سے روانہ کیا گیا۔فوج کو سمندری راستہ سے حملہ آور ہونے کا حکم ملا۔اہل شہر نے اپنی کمزوری محسوس کر کے صلح کی درخواست کی لیکن مسلمان فوجوں نے قبول نہ کی اور شہر فتح کرنے کے ارادہ پر قائم رہے۔رومیوں کی کمزوری کی اصلی وجہ ان کا نااہل بادشاہ تھا۔انھوں نے اسے قتل کر کے لیون (Leon) کو بادشاہ بنالیا۔یہ شخص مسلمانوں کے امدادی کی حیثیت سے ان کے ساتھ آیا تھا،اس لیے ان کی کمزوری سے واقف تھا لہٰذا بادشاہت ملنے کے بعد اس نے مسلمانوں کے خلاف کامیاب مدافعت کی۔ موسم سرما کی برف باری سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا۔اسی دوران سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہوگیا اور فوج کو ناکام واپس لوٹنا پڑا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (99ھ تا 101ھ بمطابق 717ء تا 720ء)

جانشینی

آپؒ عبدالعزیز بن مروان بن حکم کے بیٹے تھے۔آپ کی والدہ اُم عاصم فاروقِ اعظمؓ کی پوتی تھیں۔اس لحاظ سے آپؒ کی رگوں میں فاروقی خون بھی رواں تھا۔خلیفہ مقرر ہونے سے پہلے ولایتِ حجاز آپؒ کے سپرد تھی۔والئ حجاز کی حیثیت سے آپؒ نے نہایت منصف مزاجی اور نیک نیتی کا ثبوت دیا۔مدینہ میں آپؒ نے ایک شوریٰ قائم کر رکھی تھی۔جس کے مشورے سے آپؒ انتظام چلاتے تھے۔ آپؒ نے مدینہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تعمیر نو بھی کی۔خلافت سے قبل آپ کی زندگی نہایت پر تکلف تھی۔آپؒ کے محل کا سامان کئی سو اونٹوں پر لدتا تھا۔

سلیمان نے 717ء میں وفات پائی۔اس کا بڑا لڑکا اس کی زندگی ہی میں فوت ہوگیا تھا اور چھوٹا بیٹا محاذ قسطنطنیہ پر تھا۔اس نے اپنے بعد اپنے بہنوئی عمر بن عبدالعزیزؒ کو ولی عہد مقرر کیا۔عمر بن عبدالعزیزؒ نہایت متقی و پارسا آدمی تھے۔کافی عرصہ سے مدینہ کے گورنر چلے آئے تھے اور گورنر کی حیثیت سے اپنی انتظامی قابلیت بھی ثابت کر چکے تھے۔اسلام کے اصولوں کے ساتھ انھیں گہرا لگاؤ تھا۔سلیمان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی تقرری وہ واحد نیکی ہے جو اس نے ساری زندگی میں سرانجام دی۔

اگرچہ حضرت عمر عبدالعزیزؒ کا عہد اہم ترین واقعات سے خالی ہے تاہم ان کے دور میں بہت سی پرکشش باتیں ہیں۔یہ درست ہے کہ عمرؒ ثانی کے عہد میں خونریزی نہیں ہوئی اور غداروں کے واقعات بھی وقوع پذیر نہیں ہوئے اور یہ بھی کہ عہد حکومت میں خلیفہ نے خلافت راشدہ کے نظام کو بحال کرنے کی پوری کوشش کی۔وہ موروثی خلافت ختم نہ کر سکے لیکن خود خلیفہ کی حیثیت سے انھوں نے تمام اسلامی اصولوں پر عمل کیا اس لیے مورخین آپ کو پانچواں خلیفہ راشد گردانتے ہیں۔

خلافت کی ذمہ داری پڑتے ہی آپؒ کی اپنی زندگی میں بھی انقلاب آ گیا اور بالکل سادہ زندگی بسر کرنے لگے۔بیت المال سے صرف ایک حقیر رقم گزارے کے لیے لیتے اور اسی سے گزر اوقات کرتے۔اگر باہر سے کوئی اجنبی آ جاتا تو اس کو آپؒ کی محفل میں آ کر دریافت کرنا پڑتا کہ خلیفہ کون ہے؟ بیت المال کے مال کے سلسلے میں بہت محتاط تھے۔

اصلاحات

- اموی خلیفہ بسا اوقات عوام کی جائیدادیں غصب کر کے شاہی خاندان کے افراد کے نام منتقل کر دیتے تھے یا بیت المال کی زمینوں پر شہزادوں کا قبضہ کروا دیا جاتا تھا۔ آپؒ نے خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بنوامیہ کی تمام جائیدادوں کی تحقیق کروائی اور جو جائیدادیں ناجائز پائی گئیں ان کو ان کے اصل حق داروں تک پہنچایا گیا۔ اس کارِخیر کا آغاز آپؒ نے اپنے گھر سے کیا اور باغ فدک اور ہیرا جو آپؒ کی بیوی کو جہیز میں ملا تھا، بیت المال کو واپس کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ بنوامیہ کے مفادات اور رواج کے خلاف تھا اس لیے آپؒ کے خاندان والوں نے آپؒ کی شدید مخالفت کی لیکن آپؒ اپنا فیصلہ واپس لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔
- ملک کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے آپؒ نے وہ تمام ٹیکس منسوخ کر دیے جو اسلام کی مقررہ حدود سے متجاوز تھے۔ آپؒ نے مرکزی اور صوبائی حکام کو سختی سے منع کیا کہ بیت المال کا ایک پیسہ بھی بغیر ضرورت کے صرف نہ کیا جائے۔ آپؒ نے زمینوں کی از سرِ نو پیمائش کروائی اور زمین کی پیداواری صلاحیت کے حساب سے ٹیکس تجویز کیا گیا نیز بنجر علاقے پر سے ٹیکس معاف کر دیا گیا۔
- بیت المال جو اب تک خلیفہ اور شاہی خاندان کی عیاشیوں میں صرف ہوتا تھا ایک مرتبہ پھر عوام کا مال قرار پایا اور اسے ناداروں کی ضروریات پوری کرنے پر کھلے دل سے خرچ کیا جانے لگا۔ آپؒ نے تمام معذوروں اور ضرورت مندوں کی باقاعدہ رجسٹریشن کروائی اور ان کے وظائف جاری کیے گئے۔ مقروض، بچے اور بوڑھے بھی بیت المال سے وظیفہ پاتے تھے اور تاریخ اسلام میں ایک دفعہ پھر مستحقین کا ملنا محال ہو گیا تھا۔
- آپؒ نے زراعت کی ترقی کے لیے کاشتکاروں کی حتی الامکان امداد کی، آبپاشی کا انتظام کیا گیا اور دیگر ضروریات بھی مہیا کرنے کی کوشش کی۔
- آپؒ نے محسوس کیا کہ تکالیف کی ایک بہت بڑی وجہ ظالم گورنر ہیں، اس لیے آپؒ نے گورنروں کو اس سلسلہ میں سخت ہدایات بھیجیں اور ان کا محاسبہ کیا۔
- اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے آپ تبلیغِ اسلام کے فریضہ سے بھی غافل نہ تھے چنانچہ تبت اور چین میں دین کے مبلغ بھیجے گئے۔ سندھ کے سرداروں کو دعوت دین دی گئی۔ ان کوششوں کے نتیجہ کے طور پر ہزاروں لوگ مسلمان ہوئے۔
- حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے سے اموی خلفا میں یہ رسم رائج ہو گئی تھی کہ حضرت علیؓ کے خلاف خطبہ جمعہ میں زہر اگلا جاتا تھا یہ کوئی پسندیدہ صورت نہیں تھی نیز خطبہ میں اس کی شمولیت بدعت تھی۔ آپؒ نے اس کو بند کر دیا اور اس کی بجائے قرآن مجید کی آیت خطبے میں شامل کی گئی:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ
يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○(سورۃ نحل 90)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ عدل کا، بھلائی کا اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں، ناشائستہ حرکتوں اور ظلم وزیادتی سے روکتا ہے، وہ خود تمھیں نصیحتیں کر رہا ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (90)

اس اقدام سے بنو ہاشم اور اہل بیت پر بہت خوشگوار اثرات مرتب ہوئے اور ان قائدین کی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ساتھ دوستی ہو گئی۔

- عمر بن عبدالعزیزؒ نے دین کے فروغ کے لیے شعوری کوششیں کیں۔ آپؒ نے ان تمام غلط نظریات کی حوصلہ شکنی کی جو مسلمانوں میں رائج ہو رہے تھے۔ بدعات اور بری رسومات کو سختی سے روکا۔ اقامتِ صلوٰۃ کی طرف توجہ دی گئی مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ قرآن و حدیث کے علوم کو پھیلایا گیا اور مسلمانوں کو اپنی زندگیاں اسلام کے مطابق گزارنے کے مواقع فراہم کیے گئے۔
- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خلافت راشدہ کے نظامِ عدل کو بھی بحال کیا چنانچہ صرف شک کی بنیاد پر کسی کو نہ گرفتار کیا جاتا تھا نہ سزا دی جاتی تھی۔ شرعی حدود پر سختی سے عمل کیا گیا اور جن جرائم کے لیے حد نہیں تھی وہاں تعزیر کی حدود زیادہ سے زیادہ 30 کوڑے مقرر کی گئی۔ قیدیوں کو خوراک کی بجائے ماہوار رقم دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا تاکہ وہ اپنی مرضی کا کھانا کھائیں۔ مختلف نوعیت کے قیدیوں کو الگ الگ رکھا جاتا تھا اور کسی قیدی کو بھاری بیڑیاں نہیں پہنائی جاتی تھیں۔
- غیر مسلموں اور نومسلموں کے ساتھ اسلامی قانون کے تحت معاملہ کیا جاتا تھا۔ القصہ خلافتِ راشدہ کی سی فضا پیدا ہو گئی اس لیے آپ کو پانچواں خلیفہ راشد بھی کہا جاتا ہے۔

بنوامیہ کے زوال کے اسباب

بنوامیہ کو ایک عظیم سلطنت وراثت میں ملی تھی خود انھوں نے بھی اس میں گرانقدر اضافے کیے۔ اس کی سرحدیں وسط یورپ تک پہنچا دیں۔ قتیبہ نے ترکستان کے بیشتر حصے پر قبضہ کیا، محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا، مسلمہ بن عبدالملک جیسا لائق جرنیل مسلسل کئی سال تک رومیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔ بنوامیہ کے پاس حجاج بن یوسف جیسا عمدہ منتظم سلطنت اور معاویہؓ کے عہد جیسے اعلیٰ سیاست دان بھی موجود تھے لیکن اس کے باوجود اموی حکومت نوے سال سے زائد قائم نہ رہی۔ اس کی وجوہات مندرجہ ذیل تھیں۔

1- آمرانہ نظام

اموی حکومت خلافت راشدہ کے خاتمہ کے نتیجہ کے طور پر قائم ہوئی تھی۔ ابتداً اموی حکمرانوں نے نہایت قابلیت کے ساتھ نظام حکومت چلایا۔ چونکہ ان کا نظام حکومت آمرانہ تھا اور اسلامی نظام حکومت جمہوری تھا لہٰذا ان کی حکومت جلد زوال پذیر ہو گئی۔

اموی خلفا کی حکومت شخصی تھی۔ خلیفہ سیاہ وسفید کا مالک تھا، شوریٰ کے ادارہ کا وجود برائے نام تھا۔ اس کے ممبر خلیفہ کے حواری ہوتے تھے اور خلیفہ کے کسی حکم پر اعتراض کرنے کا حق نہ رکھتے تھے۔ عوام کو خلیفہ سے باز پرس کا حق نہیں تھا۔ بیت المال خلیفہ کی ذاتی ملکیت

شمار ہوتا تھا۔ صلحائے امت کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ خلفائے بنوامیہ کا طریقہ ابوبکرؓ وعمرؓ جیسا نہیں بلکہ قیصر و کسریٰ کا طریقہ ہے۔ عوام اس کا خلافتِ راشدہ سے تقابل کرتے تھے اس لیے اس نظام سے مطمئن نہیں تھے لہٰذا مسلمانوں میں سے صالح عنصر نے ہمیشہ اموی حکومت کو ناپسند کیا اور اس کو بدلنے کی ہر کوشش کا ساتھ دیا۔

2- شاہ پسندی

عربوں نے عراق و ایران کو فتح کر لیا تھا اور یہاں کے باشندے مسلمان بھی ہو گئے تھے لیکن ان کی شاہ پسندی اپنی جگہ پر قائم تھی۔ وہ اپنی فطری شاہ پسندی کی وجہ سے اہلِ بیت کو خلافت کے جائز وارث سمجھتے تھے لہٰذا وہ اموی خلفا کو غاصب گردانتے تھے۔

3- خوارج

آخری اموی فرماں روا مروان ثانی ابومسلم خراسانی کی بغاوت کے وقت خوارج کے مقابلے میں ہی مصروف تھا، اس لیے وہ نصر بن سیار گورنر خراسان کی کوئی مدد نہ کر سکا اور اس طرح خوارج بنوامیّہ کے زوال کا سبب بنے۔

4- بربروں کی بغاوتیں

اموی دور کے بہت سے گورنر ظالم تھے۔ عوام کے حقوق کا خیال نہ رکھتے تھے۔ ابن اشعث کی بغاوت، خارجیوں کی مقبولیت، افریقہ میں بربروں کی بغاوتیں اور بربروں کا خارجیوں کے ساتھ متحدہ محاذ اس کا واضح ثبوت ہیں۔

5- اصولِ جانشینی کا فقدان

بنوامیہ میں جانشینی کا کوئی متعین نظام نہ تھا۔ اموی خلفا نے ایک کی بجائے دو دو جانشین نامزد کرنے شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر خلیفہ اپنی زندگی میں کوشش کرتا کہ وہ اپنے جانشین کو ولی عہدی سے الگ کر کے اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر کرے، چنانچہ اقتدار کی اس باہمی کش مکش سے خاندان بنوامیہ کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔

6- سپہ سالاروں کے ساتھ ناروا سلوک

بنوامیہ نے اپنے وفادار فوجی سالاروں کی قدر نہ کی۔ قتیبہ بن مسلم اور ابن اشعث کو اپنی جان کی حفاظت کے لیے بغاوت کرنا پڑی۔ محمد بن قاسم کو قتل کر دیا گیا، طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کو بھی ان کی خدمات کا صلہ دینے کی بجائے تنگ کیا گیا۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخری دور میں قابل لوگوں نے بنوامیہ کی فوجی خدمت سے منہ موڑ لیا۔

8- قبائلی تعصب

عرب میں زمانہ قدیم سے قبائلی نظام رائج تھا اور قبائل میں باہمی تصادم بھی ہوتا رہتا تھا۔ یہ قبائلی منافرت باقاعدہ خانہ جنگی کی صورت اختیار کر چکی تھی اور نصر بن سیار حاکم خراسان کے مقابلے میں ابومسلم خراسانی کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ قبائلی جنگیں تھیں۔

اموی حکومت بنیادی طور پر عرب حکومت تھی۔ غیر عرب قومیں اسلام کے تصور مساوات سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئی تھیں لیکن عبدالملک بن مروان نے ان کو دوسرے درجہ کا شہری بنا دیا۔ عربی زبان کی ترویج نے غیر عرب قوموں کے لیے ملازمت کے دروازے بند کر دیے۔ امویوں نے عجمیوں کو اعلیٰ عہدے دینے سے انکار کر دیا بلکہ میدانِ جنگ میں بھی یہ امتیاز برقرار رکھا جاتا تھا۔ عرب کا مالِ غنیمت اور انعامات میں حصہ زیادہ تھا جبکہ غیر عرب نظر انداز کیے جاتے تھے۔

9- نااہل جانشین

بنو امیہ کے آخری خلفا حکومت چلانے کے اہل نہ تھے سلیمان بن عبدالملک نے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کو جانشین مقرر کر کے اموی اقتدار کے زوال کو وقتی طور پر روک دیا تھا لیکن یزید ثانی اور ولید ثانی نے اپنی نااہلی سے زوال کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ مروان ثانی میں اگرچہ شجاعت و بہادری موجود تھی تاہم اس میں تدبر اور وسعتِ ظرف کی کمی تھی اور اس کی یہ خامیاں اموی حکومت کے لیے جان لیوا ثابت ہوئیں۔

10- عباسی تحریک

بلاشبہ بنو امیہ کے زوال میں ابو مسلم کی شخصیت کا بھی بہت بڑا کردار ہے۔ وہ نہایت مدبر منتظم اور ذہین سازشی تھا۔ بنو امیہ کے خلاف تحریک کے لیے صحیح جگہ وقت اور موزوں ترین طریق کار کا انتخاب اس کی ذہانت کی دلیل ہے۔ بلاشبہ عباسی دعوت کو ایسا داعی ملنا اس کی خوش قسمتی تھی اور مروان بن الحکم اپنی پوری قابلیت کے باوجود اس کی ذہانت و سیاست کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

مشقی سوالات

1۔ درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیں۔

i- حضرت امیر معاویہؓ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد جو تبدیلیاں اسلامی طرزِ حکومت میں رونما ہوئیں ان پر بحث کریں۔

ii- حضرت امیر معاویہؓ کے قائم کردہ نظامِ حکومت کا جائزہ لیں۔

iii- سانحۂ کربلا کے واقعات، نتائج و اثرات بیان کریں۔

iv- حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی اُن سیاسی غلطیوں کا جائزہ لیں جن کی وجہ سے وہ بنو امیہ کے مقابلہ میں ناکام رہے۔

v- عبدالملک بن مروان کی اصلاحات کا تنقیدی جائزہ پیش کریں۔

vi- ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت کو بنو امیہ کا سنہری زمانہ کہا جاتا ہے، واضح کریں۔

vii- سلیمان بن عبدالملک کے دورِ حکومت کا مختصر جائزہ لیں۔

viii- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا کردار اور کارنامے بیان کریں۔

xi- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو پانچواں خلیفۂ راشد کیوں کہا جاتا ہے؟ جائزہ لیں۔

-x بنوامیہ کے زوال کے اسباب تفصیلاً بیان کریں۔

-2 مختصر جواب لکھیں:

-i اموی فوج کے کس سالار نے آخری وقت حضرت امام حسینؓ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور شہید ہوا؟

-ii نومسلموں پر جزیہ لگانے کا آغاز کس نے کیا؟

-iii محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم کو کس کے عہد میں قتل کیا گیا؟

-iv قسطنطنیہ پر حملہ کس کے عہدِ حکومت میں ہوا؟

-v عمر بن عبدالعزیزؒ کب والئی مدینہ بنے؟

-vi ڈاک کا نظام دور بنوامیہ میں کس نے قائم کیا؟

-vii عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کب ہوئی؟

-viii بنوامیہ کے زوال اور بنوعباس کی حکومت کے قیام میں کس شخص نے بنیادی کردار ادا کیا؟

-ix امیر معاویہؓ نے انتظامِ سلطنت کو بہتر بنانے کے لیے جو اقدامات کیے ان میں سے دو تحریر کریں۔

-x عمروؓ بن العاص نے امیر معاویہ کی خلافت قائم کرنے میں کیا کردار ادا کیا؟

-xi حضرت حسنؓ نے سادہ کاغذ پر کون سی شرائط امیر معاویہ کو دیں۔

-xii عبدالملک کی کوئی سی دو اصلاحات تحریر کریں۔

-xiii حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت عبداللہ بن زبیرؓ کہاں تھے؟

-xiv عبداللہ بن زبیرؓ کی پیدائش مسلمانوں کے لیے کیوں باعثِ مسرت بنی۔

-xv سانحہ کربلا کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ کا کیا کردار تھا؟

-xvi واقعہ حرّہ کیا تھا؟

-xvii ولید بن عبدالملک کی حکومت کا آغاز کب ہوا؟

-xvii بنوامیہ کی حکومت کتنے سال قائم رہی؟

-xix حرمِ کعبہ پر پتھراؤ کس حکمران کے عہد میں ہوا۔

-3 مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پر کریں۔

-i امیر معاویہؓ.................. کے صاحبزادے تھے۔

-ii امیر معاویہؓ.................. کے موقع پر اسلام قبول کیا۔

-iii حضرت عمرؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو.................. کا گورنر مقرر کیا۔

-iv عمروؓ بن العاص نے.................. کے بعد اسلام قبول کیا۔

-v عمروؓ بن العاص کا تعلق مشہور قبیلہ.................. سے تھا۔

-vi حضرت حسنؓ تقریباً.................. مہینے تک خلیفہ رہے۔

-vii عبدالملک کی اصلاحات میں سب سے اہم.................. زبان کی ترویج تھی۔

-viii خلیفہ سے اجازت لے کر.................. نے قرآن پر اعراب لگوائے۔

-ix عبداللہ بن زبیرؓ.................. کے نواسے تھے۔

-x عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت کا خاتمہ.................. کے ہاتھوں ہوا جس نے خانہ کعبہ پر بھی پتھراؤ کرنے سے گریز نہ کیا۔

-xi واسط کا شہر.................. کے عہد میں تعمیر ہوا۔

-xii بلاشبہ بنوامیہ کے زوال میں.................. کی شخصیت کا بہت بڑا کردار ہے۔

-xiii کوفیوں کی غداری کے بعد مسلم بن عقیل نے.................. ہاں پناہ لی۔

-xiv .... کا دور اموی خاندان کا سنہری دور کہلاتا ہے۔

-xv حضرت امام حسینؓ کی شہادت.................. ء میں ہوئی۔

باب
7

بنواُمیّہ کے کارہائے نمایاں

انتظامِ سلطنت

اموی دور میں سربراہ مملکت کے لیے خلیفہ کی اصطلاح جاری رکھی گئی بلکہ خلافتِ راشدہ کے طریقے کے مطابق خلیفہ کو ''امیرالمومنین'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یہ ایک موروثی حکومت تھی جس میں باپ کے بعد بیٹا یا مرنے والے خلیفہ کا نامزد کوئی دوسرا شخص جانشین ہوتا۔ بعض اوقات خلیفہ اپنے دونوں بیٹوں کو یکے بعد دیگرے اپنا ولی عہد مقرر کرتا۔ خلیفہ منتخب ہونے کے لیے بیعت لی جاتی۔

شوریٰ کی ایک ظاہری شکل بھی اس دور میں موجود چند اکابرین پر مشتمل مشاورتی ادارہ موجود تھا تاہم اس کے ارکان کی نامزدگی شاہی خاندان میں سے کی جاتی یا ایسے مصاحبین اس میں شامل کیے جاتے جو خلیفہ کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ بیت المال کا ادارہ بھی اموی دور میں موجود رہا اس میں کافی مال جمع ہوتا تھا۔

انتظامی سہولت کے لیے حکومت کے کاروبار کو مندرجہ ذیل شعبہ جات میں تقسیم کیا گیا تھا:

1- دیوان الجند

محکمہ دفاع، فوج کا انتظام اس شعبہ کے ذمہ تھا۔

2- دیوان الخراج یا شعبہ مالیات

ذرائع آمد و خرچ پر کنٹرول یہ شعبہ کرتا تھا۔

3- دیوان الرسائل یا سیکرٹریٹ

مختلف شعبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور خلیفہ کی طرف سے جاری کردہ احکام کا ریکارڈ رکھنا اس شعبہ کے فرائض میں شامل تھا۔

4- دیوان الخاتم

خلیفہ کے احکام کا ریکارڈ رکھنا اس شعبہ کی ذمہ داری تھی۔ اس مقصد کے لیے شاہی فرمان کی نقول بھی محفوظ رکھی جاتی تھیں۔

5- دیوان البرید

یہ شعبہ ڈاک اور سراغ رسانی دونوں فرائض سرانجام دیتا تھا۔ ذرائع رسل و رسائل کی ترقی بھی اس شعبہ کے ذمہ تھی۔

پانچ بڑے صوبے

صوبہ شام کا بندوبست براہ راست خلیفہ کے ماتحت ہوتا تھا لیکن باقی علاقے کو پانچ بڑے صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر بڑا صوبہ متعدد چھوٹے چھوٹے صوبوں میں منقسم ہوتا تھا، جن کے والی بڑے صوبے کے گورنر کے ماتحت ہوتے تھے۔ پانچ بڑے صوبے یہ تھے۔

1- عراق

یہ صوبہ عراق، عرب، عراق عجم، عمان، بحرین، کرمان سیستان، کابل، خراسان اور سندھ کے صوبوں پر مشتمل تھا اور اس کو اصطلاح میں ''مشرق'' کہا جاتا تھا۔

2- جزیرہ

یہ صوبہ جزیرہ اور آرمینیا کے صوبوں پر مشتمل تھا۔

3- افریقہ

یہ صوبہ شمالی افریقہ، سپین، جنوبی فرانس، سسلی، سارڈینیا اور اٹلی کے دیگر جزائر پر مشتمل تھا اور اصطلاح میں ''مغرب'' کہلاتا تھا۔

4- مصر

یہ صوبہ صرف مصر ہی کے علاقے پر مشتمل تھا۔

5- حجاز

صوبہ حجاز کا گورنر یمن نجد کے علاقوں کا بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔

اہم عہدے

ہر صوبہ میں والی (گورنر) عامل (خزانچی)، کاتب (سیکرٹری) صاحب الخراج (وصول کنندہ خراج)، صاحب الشرطہ (پولیس افسر) اور قاضی (جج) اپنے اپنے شعبوں کا انتظام چلانے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ ہر صوبہ میں والی (گورنر) کے علاوہ عامل کا تقرر الگ کیا جاتا جس کا کام خراج وغیرہ وصول کرنا تھا۔ عامل بالعموم براہ راست مرکز کے ماتحت ہوتا تھا۔ ذرائع آمدن مندرجہ ذیل تھے۔

1- زکوٰۃ

حسب شریعت صاحب نصاب مسلمانوں سے 2.5 فیصد سالانہ وصول کی جاتی تھی۔

2- مالیہ

اس کی شرح مختلف زمانوں میں مختلف تھی اور ہر خلیفہ حسب منشا اس میں کمی بیشی کر سکتا تھا اور یہ زرعی زمین سے حاصل ہونے والی

آمدنی میں سے وصول کیا جاتا تھا۔

3- جزیہ

غیر مسلموں سے ان کی حفاظت کے عوض یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔

4- کسٹم ڈیوٹی

غیر ملکوں سے جو مال درآمد ہوتا تھا اس پر یہ ٹیکس لگایا جاتا تھا۔

5- خراج

مفتوحہ علاقے جن پر کسی معاہدہ کی رو سے قبضہ کیا گیا تھا۔ اس معاہدہ کے مطابق مفتوحہ علاقے پیداوار کا ایک حصہ خراج کے طور پر ادا کرتے تھے۔

6- خُمس

مال غنیمت کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں جاتا تھا، جو خُمس کہلاتا تھا۔

7- خلیفہ کی ذاتی جاگیریں

اموی خلیفہ کافی زمین اپنی ذاتی جاگیر کے طور پر رکھتے تھے۔ اس کی آمدنی براہ راست بیت المال میں جاتی تھی۔

فوج

امیر معاویہؓ کے زمانے میں ایک لاکھ اسی ہزار فوج بھرتی کی جا چکی تھی۔ فوج میں عرب اور موالی دونوں بھرتی ہو سکتے تھے۔ تمام عربوں کے لیے فوج میں بھرتی ہونا لازمی تھا اور اس کے لیے ان کو سرکاری خزانے سے وظیفہ ملتا تھا۔ جب وہ لڑائی میں مشغول ہوتے تھے اس وقت خاص تنخواہ بھی ملتی تھی۔ اعلیٰ عہدے بالعموم عربوں کو ملتے تھے۔ سوار دستے بھی عربوں پر ہی مشتمل ہوتے تھے۔

اموی فوج بھی بازنطینی فوج کی طرح ہی منظم ہوتی تھی۔ گرمائی اور سرمائی فوج الگ الگ ہوتی تھی۔ لڑائی کے وقت فوج کو مرکز (قلب) دائیں بازو (میمنہ) بائیں بازو (میسرہ) ہراول دستے (مقدمہ) اور حفاظتی دستے میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ لڑائی بالعموم لائنوں میں ہوتی تھی۔ ایک سپہ سالار کے تحت بہت سے امیر ہوتے تھے۔ فوج کا انتظام صوبوں کے گورنروں کے ماتحت ہوتا تھا۔

اموی فوج بالعموم وہ تمام ہتھیار استعمال کرتی تھی جو قرون وسطیٰ میں رائج تھے۔ اموی دور کی ایک نمایاں چیز بحری فوج کا قیام ہے۔ امیر معاویہؓ نے اپنی گورنری کے زمانہ میں ہی بحری فوج قائم کرنی شروع کر دی تھی۔ خلیفہ بننے کے بعد آپ نے ایک عظیم بحری فوج مرتب کی۔ ولید بن عبدالملک کے عہد میں اس شعبہ کی اور بھی زیادہ ترقی ہوئی۔ موسیٰ بن نصیر نے تیونس میں جہاز سازی کے کارخانے قائم کیے اور سو جہازوں پر مشتمل ایک بحری بیڑہ بنایا۔ ولید کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس پانچ بحری بیڑے تھے۔ پرانے قلعوں کی تعمیر نو کروائی

نیز نئے قلعے بھی تعمیر کروائے۔

نظامِ عدل

مسلمانوں کی حکومت میں عدلیہ ہمیشہ بہت اہم شعبہ رہا ہے۔ بنوامیہ کو اس کا احساس تھا کہ ایماندار اور ذمہ دار عدلیہ عوام کا اعتماد بحال رکھنے میں کیا کردار ادا کرتی ہے۔

عدلیہ کی تنظیم بالعموم خلافت راشدہ کی طرز پر ہی قائم رکھی گئی۔ ہر ضلع میں قاضی مقرر کیا جاتا تھا اور صوبہ میں ''قاضی القضاۃ'' مقرر ہوتا تھا۔ قاضی کو بعض اوقات اوقاف وغیرہ کی نگرانی کے فرائض بھی سونپ دیے جاتے تھے البتہ اموی دور میں قاضیوں کا تقرر صوبائی گورنر ہی کی طرف سے ہوتا تھا جو اسے معزول کرنے کا اختیار بھی رکھتا تھا۔ عوام ان کے فیصلے بدستور نہایت دیانتداری سے اور اسلامی قانون کے تحت ہی ہوتے تھے اور ذمیوں کے فیصلے ان کے ذاتی قانون (Personal Law) کے تحت ہوتے تھے۔

بنوامیہ نے گورنروں اور بااثر لوگوں کے مظالم کے انسداد کے لیے دیوان مظالم کے نام سے ایک الگ عدالت بھی قائم کی تھی جس کی صدارت بالعموم خلیفہ خود کرتا۔ کبھی کبھار ''قاضی القضاۃ'' بھی اس کی صدارت کرتا تھا۔

اموی دور میں ثقافتی وسماجی ترقی

علم وادب

اسلام نے حصول علم کی جس طرح حوصلہ افزائی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اموی قوم کے افراد نے پڑھنا لکھنا سیکھا۔ قرآن وحدیث کو اپنے سینوں میں محفوظ کیا۔ ان کی تعلیمات کو سمجھا اور معلم قرار پائے۔ انھوں نے دوسری قوموں کے عوام سے بھی فائدہ اٹھایا اور حقائق کو قصے کہانیوں سے الگ چھانٹ کر ان کو نئے اسلوب سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے۔ جس کا آغاز عہد نبوت اور خلافت راشدہ میں ہوا اور جس کے بھرپور مظاہر خلافت عباسیہ میں سامنے آئے۔ عہد بنوامیہ میں یہ ارتقا غیر محسوس طریقے سے جاری رہا۔

قرآن

اموی دور کی فتوحات نے ان علاقوں کی تعداد میں بہت اضافہ کر دیا جہاں اسلام کی تبلیغ ہو سکتی تھی چنانچہ مفتوحہ قوموں کے بے شمار افراد نے قرآن پاک لکھنا شروع کیا لیکن ان کے لیے اعراب کے بغیر کتاب اللہ کو پڑھنا ممکن نہ تھا، اس لیے عبدالملک بن مروان نے اپنے دور حکومت میں قرآن پاک پر اعراب لگوائے اور ایک جیسے حروف کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے نقطے لگائے گئے۔ عبدالملک خود قرآن پاک سے گہرا شغف رکھتا تھا اور عمرؒ بن عبدالعزیز کے دینی ذوق کے بارے میں تو دو آرا ہو ہی نہیں سکتیں۔ ان دونوں خلفاء کے زمانوں میں قرآن پاک کے حفظ کے علاوہ تفسیر لکھنے کی طرف بھی توجہ دی گئی۔

حدیث

حدیث کی تدوین کے نقطہ نظر سے بھی اموی دور بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس دور میں بعض صحابہؓ، تابعین کی کثیر تعداد اور تبع تابعین موجود تھے اس لیے فطری طور پر یہ روایات جمع کرنے اور ان کو مرتب کرنے کا دور تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس شعبہ کی طرف توجہ فرمائی اور احادیث کے مجموعے مرتب کروائے اور ان کی نقول دور دراز کے علمی مراکز کو بھجوائیں۔

فقہ

فقہ کی ترقی کے اعتبار سے بھی یہ دور انتہائی اہم ہے۔ احکام دین کی تشریح کے لیے اس زمانے میں صحابہ زادے موجود تھے جو بیک وقت محدّث بھی تھے اور فقیہ بھی۔ ابراہیم نخعی، امام جعفر صادقؒ، عبدالرحمٰن بن ابی سلمی اور قاضی شریح اس دور کے نامور فقہا ہیں۔

تاریخ

تاریخ نویسی کی بھی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ غزوات کے حالات اور سیرت کی کتب تیار کی گئیں۔ اس سلسلے کی اہم کتب عروہ بن زبیر اور محمد بن اسحٰق نے لکھیں۔ ابن اسحٰق کی مرتب کردہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بنیاد ہی پر بعد میں سیرت ابن ہشام مرتب کی گئی جو آج تک سیرت کی اہم ترین کتاب ہے۔ قدیم عرب اور ایران کے ساسانی حکمرانوں کے حالات بھی اس دور میں قلم بند کیے گئے۔

فلسفہ اور طب

فلسفہ اور طب کی جو ترقی عباسی دور میں سامنے آئی اس کی خشت اول دور بنوامیہ ہی میں رکھی گئی تھی۔ یونانی فلسفہ و منطق کے اثرات اسی دور ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ یونانی طب نے بھی اس زمانے میں فروغ پایا۔ حکیم حارث بن کلاوہ اور اس کا بیٹا طائف کے معروف طبیب تھے۔

شعروشاعری

اموی حکمران شعروشاعری کے سرپرست تھے۔ امیر معاویہؓ یزید اول اور عبدالملک بن مروان شاعروں کی قدردانی اور سرپرستی کرتے۔ دربار میں درباری شعرا موجود رہتے۔

خطاطی

عہد بنوامیہ میں کتابت اور انشا کے فن نے بہت عروج حاصل کیا۔ حکومت اور امرا کاتب ملازم رکھتے تھے۔ فن انشا کو سرکاری طور پر بہت اہمیت حاصل تھی اور کئی کتابیں لکھی گئیں۔ عبدالملک کا کاتب عبدالحمید اس فن کا امام تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کتابت عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید (عباسی عہد) پر اس کا خاتمہ ہوا۔

فنِ تعمیر اور عمارات

اموی دور سے پہلے اسلامی فن تعمیر کا کوئی وجود نہ تھا۔ سادہ سی عمارات بنائی جاتی تھیں۔ اموی دور میں ایرانی و رومی تہذیبوں کے ساتھ رابطہ قائم ہوا تو پرشکوہ عمارات تعمیر کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔ فطری طور پر اس شان و شوکت کا پہلا مظاہرہ عظیم مساجد کی تعمیر کی صورت میں ہوا۔ امیر معاویہؓ کے دور میں کوفہ کی چھاؤنی تعمیر ہوئی تو اس کے وسط میں ایک عظیم الشان مسجد بنائی گئی۔ بعد ازاں بصرہ کی

مساجد کی تعمیر نو ہوئی تو ساسانی معماروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ان دونوں عمارات میں ساسانی طرز کے ستون بنائے گئے۔نیز بصرہ کی مسجد میں پہلی بار ایک مینار تعمیر ہوا جو بعد ازاں اسلامی فنِ تعمیر کا امتیازی نشان قرار پایا۔عبدالملک کے زمانہ میں اسلامی فنِ تعمیر میں مزید ترقی ہوئی۔عبدالملک نے مسجدِ اقصیٰ کی تعمیرِ نو بھی کی۔

خلفائے بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک کا زمانہ تعمیرات کے لیے بے حد مشہور ہے۔اس کے زمانہ کی مشہور عمارات جامع دمشق، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں توسیع اور مسجد اقصیٰ اسلامی تہذیب وتمدن اور فنِ تعمیر کا شاہکار ہیں۔

مذہبی عمارات کے علاوہ تعمیرات کے میدان میں مسلمانوں کی دیگر یادگاریں بھی ہیں۔مثلاً صحرائی محلات جن میں شاہی خاندان کے افراد قیام کرتے تھے۔ان محلات میں قصرِ خضرا اور قصرِ عمرو وغیرہ مشہور ہیں۔اس قسم کے صحرائی محلات کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔

مصوری

اسلام شبیہ سازی یا مجسمہ گری کی اجازت نہیں دیتا۔اس بنا پر عمارات میں کہیں بھی تصاویر یا انسانی اور حیوانی شبیہ نہیں بنائی گئیں۔صرف ہندسی اشکال یا پھل پھول کا سہارا لیا، یہ بیل بوٹے اور نقش ونگار اسلامی مصوری کی بنیاد قرار پائیں۔

موسیقی

اسلامی کلچر اور تہذیب وتمدن میں نغمہ وسرور، موسیقی اور راگ رنگ کو بطور فن اور مشغلہ کے کبھی بھی پسندیدہ شمار نہیں کیا گیا بلکہ اسے لہو ولعب قرار دے کر اس سے اجتناب ہی کی تلقین کی گئی۔ظہور اسلام سے قبل گیت، راگ اور راگنیاں اور موسیقی کے ساز وغیرہ اہل عرب میں رائج تھے لیکن خلفائے راشدین کے زمانے میں ایسی تمام سرگرمیاں فسق وفجور کے ذیل میں شمار کی گئیں اور ان کو قبول عوام حاصل نہ ہوسکا اور ایسے تمام فنون اور سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی کی گئی لیکن بنوامیہ چونکہ شاہی روایات اور اطوار کو اپنا چکے تھے اس لیے ایک بار پھر راگ رنگ اور موسیقی کو خوب رواج ہوا۔

مشقی سوالات

1۔ درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات لکھیں۔

i- بنوامیہ کے انتظام سلطنت کے اہم خدوخال بیان کریں۔

ii- اموی دور میں ثقافتی وسماجی ترقی پر نوٹ لکھیں۔

2- مختصر جواب دیں۔

i- دیوان الجند سے کیا مراد ہے؟

ii- جزیہ کس ٹیکس کو کہتے ہیں؟

iii- تعمیرات کے اعتبار سے کون سا اموی حکمران مشہور ہے؟

باب
8

خلافتِ بنو عباس

عباسی تحریک سے مراد وہ تحریک ہے جس نے انتہائی منظم انداز میں دور بنو ہاشم وامیہ میں خفیہ طور پر علویوں اور عباسیوں کو اکٹھا کیا اور منصب خلافت کو اموی خاندان سے چھین کر عباسی خاندان میں منتقل کرنے کے اسباب پیدا کیے۔ بنوامیّہ کے جبر واستبداد سے نالاں طبقے اس خاموش تحریک کے ہم نوا ہوئے۔ پھر ان سب نے مل کر اموی اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور ابوالعباس عبداللہ السفاح کی سربراہی میں عباسی خاندان کو زمام اقتدار سونپ دی۔

عباسی تحریک کے ارتقائی مراحل

حضرت رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بعثت سے پہلے قریش مکہ قوت وقیادت کا مرکز سمجھے جاتے تھے۔ مکہ میں خاندان قریش کی دو شاخیں بنو ہاشم اور بنو امیہ بڑی اہم ممتاز حیثیت کی حامل تھیں۔ بنو ہاشم کو بیت اللہ کی تولیت اور دیگر مذہبی خدمات بجالانے کی بنا پر اہل عرب میں تقدس واحترام کا درجہ حاصل تھا جبکہ فوج کی سربراہی کا اعزاز بنوامیّہ کی پہچان بن چکا تھا۔ قبائلی عصبیت عربوں کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ ہاشمی اور اموی بھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں تھے اس لیے مذہبی، سیاسی اور فوجی لحاظ سے برتری حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اس طرح یہ دونوں قبیلے باہمی رقابت کا شکار تھے۔

خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ ذوالنورین کی شہادت سے حضرت حسینؓ کی شہادت تک اموی ہاشمی رقابت کا عنصر کام کرتا رہا لیکن شہادت امام حسینؓ کے بعد مختار ثقفی نے اہل بیت نبوی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حمایت کے نام پر بنوامیّہ کے خلاف ایک ایسی تحریک کا آغاز کیا جو مختلف انداز میں بنوامیّہ کے زوال تک جاری رہی۔ اسی تحریک کو بعد میں عباسی تحریک یا دعوت عباسیہ کا نام دیا گیا۔

امورِ خلافت سے حضرت زین العابدینؒ کی دست برداری کے بعد بنو ہاشم میں دو عنصر اہمیت کے حامل تھے۔

علوی (غیر فاطمی اولاد)

عباسی (نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے چچا عباسؓ کی اولاد)

حضرت زین العابدینؒ کی دست برداری کے بعد محبان اہل بیت اور بنو امیہ کے دیگر مخالفین نے تحریک کی قیادت کے لیے حضرت علیؓ کی غیر فاطمی اولاد میں سے محمد بن حنفیہ سے رابطہ کیا تو انھوں نے ان کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے تمام سرگرمیوں کو خفیہ رکھنے کی تاکید کی۔

محمد بن حنیفہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ جانشین ہوئے۔ ہر چند کہ خلفائے بنو امیہ، محمد بن حنیفہ اور ابو ہاشم

عبداللہ سے حسن سلوک کرتے رہے۔ ابو ہاشم عبداللہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی شخصیت اور خطابت سے کام لیتے ہوئے اپنی تحریک کو اس خوبی سے آگے بڑھایا کہ حکومت کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ 99ھ میں خلیفہ سلیمان بن عبدالملک سے آپ کی ملاقات ہوئی تو اس نے آپ کے رنگ ڈھنگ سے یہ باور کر لیا کہ علوی تحریک مزاحمت کے قائد آپ ہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو زہر دے دیا۔ جب آپ کی طبیعت زیادہ بگڑی تو آپ قریب ترین مقام حمیمہ چلے گئے۔

حمیمہ میں کوئی علوی موجود نہ تھا، لہٰذا آپ نے اپنی دگرگوں صحت کے پیشِ نظر محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ یہ نامزدگی ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ بنی اور امامت و خلافت کا منصب فاطمیوں اور علویوں کے ہاتھ سے عباسیوں میں منتقل ہو گیا۔ یہ اقدام عباسی خلافت کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔

محمد بن علی عباس انتہائی دانش منداور انتظامی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ انھوں نے:

i- عباسی تحریک کو ازسرِ نو منظم کیا۔
ii- حصول کامیابی کے لیے قواعد وضوابط مرتب کیے۔
iii- نقیب مقرر کیے۔
iv- ستر ارکان پر مشتمل مجلس شوریٰ قائم کی۔
v- ذمہ دار افراد کو تحریک کے لیے نامزد کرنے کا اقدام کیا۔
vi- تمام سرگرمیوں کو خفیہ رکھنے کا اہتمام کیا۔

محمد بن علی عباس کے بعد ان کے بیٹے امام ابراہیم اس تحریک کے قائد بنے۔ وہ نہایت دور اندیش انسان اور عوام میں مقبول تھے۔ ابراہیم بن عثمان المعروف ابو مسلم خراسانی گو عربی الاصل نہ تھا لیکن نہایت قابل اور ذہین انسان تھا۔ چنانچہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اس نے بہت جلد قائد تحریک کی نگاہوں میں ایک باوقار مقام حاصل کر لیا۔ امام ابراہیم نے اسے خود عباسی علم سونپ کر خراسان روانہ کیا۔ اس وقت اس کی عمر 19 سال تھی۔ عباسیوں نے اسے ناپختہ و ناتجربہ کار سمجھ کر پہلے تو اس کی زیرِ قیادت آنے سے انکار کر دیا لیکن بعد ازاں رفتہ رفتہ ان کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ ابو مسلم خراسانی نے کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کر دیا چنانچہ خراسان کے کونے کونے سے لوگ سیاہ علم لہراتے ہوئے میدان میں نکل آئے۔

ابو مسلم خراسانی کی قیادت میں عباسی تحریک بغاوت نے اس قدر زور پکڑا کہ اس کے مشہور جرنیل قحطبہ نے پے در پے مختلف علاقوں پر قبضہ کرتے ہوئے کوفہ کی طرف پیش قدمی کی۔ قحطبہ اس جنگ میں قتل ہو گیا تو اس کے بیٹے حسن نے فوج کی کمان سنبھالی اور امویوں کو شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کر لیا۔ 30 اکتوبر 749ء کو عباسیوں نے ابوالعباس عبداللہ السفّاح کو پہلا عباسی خلیفہ قرار دے کر اس کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ بعد ازاں دیگر محاذوں پر بھی عباسیوں نے کامیابی حاصل کی اور معرکہ زاب نے اموی خلافت پر مہرِ اختتام ثبت کر دی۔

بنوعباس کی خوش قسمتی تھی کہ ابومسلم خراسانی جیسا بیدار مغز، مستقل مزاج، زیرک اور دور اندیش شخص اس تحریک میں شامل ہو گیا۔ اس نے عربوں کی خانہ جنگی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ عرب قبائل کو آپس میں دست و گریبان کیا اور عربوں کو عربوں کے ہاتھوں تہ تیغ کروایا۔ خلافت عباسیہ کے قیام میں ہر ممکن مدد دی۔ اگر ابومسلم خراسانی جیسا جرات منداور توڑ جوڑ کرنے والا لیڈر عباسیوں کو میسر نہ آتا تو بنو عباس کی کامیابی کے لیے مزید کئی برس درکار ہوتے۔

عباسیوں نے حمیمہ کو تحریک کا مرکز بنالیا۔ یہ علاقہ دارالخلافہ سے بہت دور تھا۔ فوج بآسانی یہاں نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یہاں کے لوگ بلند ہمت، جفاکش اور ایفائے عہد کرنے والے تھے جس کی وجہ سے عباسیوں کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور اموی اقتدار کا سورج ڈوب گیا۔

ابوالعباس عبد اللہ السفّاح (132ھ تا 136ھ بمطابق 749ء تا 754ء)

ابوالعباس عبداللہ، محمد بن علی عباس کا بیٹا تھا۔ وہ 104ھ میں فلسطین کے ایک علاقہ بلقا کے ایک گاؤں حمیمہ میں پیدا ہوا۔ وہ عباسی تحریک کے بانی ابراہیم عباسی کا بھائی تھا۔ وہ بنوعباس کا پہلا خلیفہ نامزد ہوا اور السفّاح کے نام سے مشہور ہوا۔ السفّاح کا مطلب ہے، خونریز یعنی خون بہانے والے۔ عباسی خلیفہ کی حیثیت سے اس نے اپنا پہلا خطبہ دیا تو اس میں عوام کو خبردار کیا اور بطور انتباہ یاد دلایا کہ خبردار ہو جاؤ میں السفّاح یعنی خونریز بھی ہوں۔

ابتدائی مشکلات

ابوسلمہ خلال عباسی تحریک کا ایک بااثر داعی تھا۔ کوفہ میں ابوالعباس کی آمد سے پہلے وہ اپنا کنٹرول مکمل کر چکا تھا۔ وہ اہل بیت کا حامی تھا اور امام جعفر صادقؒ کو تخت خلافت پر متمکن دیکھنا چاہتا تھا مگر انھوں نے انکار کر دیا جس پر ابوسلمہ مایوس ہو گیا اور آخر ابوالعباس کی بیعت کر لی۔ ابوالعباس اور اس کے ساتھی ابوسلمہ خلال کے اس طرز عمل سے بددل ہو گئے۔ اس کی سابقہ قربانیوں اور قبائل پر اس کے اثر و رسوخ کی بنا پر اسے وزیر تو بنا دیا گیا مگر اعتماد کی وہ فضا جو قائم رہنی چاہیے تھی اس کا فقدان تھا۔ یہ ایک مستقل خطرہ تھا جس کا سد باب ضروری تھا۔

حجاز مقدس میں امام محمد نفس الزکیہ، واسط کی چھاؤنی میں ابن ہبیرہ اور نجد میں ابن ہبیرہ کے بیٹے نے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ موصل کے عوام نے بنوعباس کے گورنر محمد بن صول کو صوبے سے نکال دیا۔ شام اور بلقا کے علاقوں میں بھی عربوں نے طاقت حاصل کر لی۔ سندھ کے صوبہ میں منصور بن جمہور نے عباسی خلافت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حران، رقہ اور قرقساء کے عرب قبائل نے بنوعباس کی بیعت فسخ کر دی۔ آرمینیہ کے عوام نے عرب جرنیل اسحاق بن مسلم عقیل کو اپنا سپہ سالار بنا لیا یہ تمام عناصر بنوعباس کی نئی مملکت کے لیے سُمِّ قاتل بن سکتے تھے۔

بنوعباس کو برسر اقتدار لانے میں ایرانیوں کی شعوبی تحریک کو نمایاں مقام حاصل رہا۔ شعوبی تحریک ایران سے عرب تہذیب و تمدن

کے اثرات کو مکمل طور پر ختم کرنا چاہتی تھی۔

عمان اور بحرین وغیرہ خوارج کے پرانے مرکز تھے۔ انھوں نے بنوعباس کی مخالفت نہیں کی۔ اگر چہ وہ بنوامیّہ کی طرح بنوعباس کو بھی خلافت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ یہ لوگ انتہائی بہادر، جفاکش اور جذبہ جانفروشی سے مالا مال تھے۔ عباسی خلافت کے بعد جب امویوں اور عربوں پر بے پناہ ظلم وستم ہوئے اور ان کا قتل عام ہوا تو وہ بھی میدان میں آ گئے۔

ابوالعباس عبد اللہ کا مشکلات پر قابو

ابوالعباس نے بڑی مستقل مزاجی اور سیاسی تدبر سے بنوامیّہ اور ان کے حامیوں کی بغاوتوں کو فرو کیا۔ باغی اتحاد کی کمی کے باعث اجتماعی قوت نہ بن سکے۔ کچھ قتل ہوئے اور کچھ نے امان چاہی اور ابوالعباس کی اطاعت قبول کر لی۔

اہلِ بیت اموی دور کی طرح عباسی دور میں بھی خلافت کے دعویدار رہے مگر اس دعوے کی کبھی بھی پذیرائی نہیں ہوئی چنانچہ محبانِ اہلِ بیت نے عباسیوں کے خلاف بخارا، خراسان، موصل اور سندھ میں بغاوت جاری رکھی۔ ابوالعباس نے ہزاروں باغیوں کو نیست و نابود کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض علویوں کو انعام و اکرام سے نوازا اور اپنی فیاضی اور سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ اس طرح دوہری حکمت عملی سے علویوں کا خطرہ دور کیا۔

ابوالعباس نے پہلے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا مگر کوفیوں کی تاریخی بدعہدی اور متلون مزاجی کے ڈر سے عراق کے ایک چھوٹے سے قصبے انبار کے نزدیک ایک نیا شہر بسایا جس کا نام ہاشمیہ رکھا اور آہستہ آہستہ حکومت کے تمام دفاتر وہیں منتقل کر لیے۔

ابوالعباس نے حکومت میں بہت سی انتظامی تبدیلیاں کیں۔ تقریباً تمام علاقوں میں اپنے رشتہ دار بطور والی مقرر کیے۔ اپنے بھائی ابوجعفر منصور کو جزیرہ آذر بائیجان اور آرمینیہ کا حاکم بنایا۔ اپنے چچا داؤد کو مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، یمن اور یمامہ کا حاکم بنایا۔ سلیمان بن علی کے زیرنگین بصرہ، بحرین، عمان اور اہواز آ گئے۔ ابومسلم کو خراسان کا حاکم بنایا اور مصر کی حکومت ابوعون عبدالملک بن یزید کو دے دی۔ ان تبدیلیوں سے ملک میں امن وامان کی حالت بہتر ہوگئی۔

ابوالعباس عبداللہ کی سیرت وکردار

ابوالعباس پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا قد لمبا، رنگ گورا، ستواں ناک، گھنگھریالے بال اور خوبصورت باریش چہرہ تھا۔ وہ مدبر، فیاض، سخی، باوقار احسن اخلاق سے مالا مال تھا۔ اس کی والدہ کا نام رائطہ الحارثیہ تھا۔ وہ اپنے عزم میں راسخ تھا۔ ایک دفعہ جو ارادہ کر لیتا اسے پورا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ تخت خلافت پر متمکن ہونے کے بعد جتنی مشکلات اسے پیش آئیں وہ ان سب سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہوا۔

سفا کی اور خون ریزی سے قطع نظر وہ ایک مدبر، عقلمند اور انتظامی امور کا ماہر تھا۔ بدامنی، طوائف الملوکی کی فضا مملکت میں موجود تھی۔ نئی حکومت کو اپنے پاؤں مضبوط کرنے کے لیے اس پر ہر طرح سے قابو پانا تھا۔ مختلف تاریخ دان اس کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ بغاوتوں کا استیصال، انتظامی ڈھانچے میں تبدیلیاں، علویوں کے ساتھ حسن سلوک اس کے تدبر اور معاملہ فہمی کی

کچھ مثالیں ہیں۔

عام حالات میں ابوالعباس نہایت حلیم، بردبار اور عفوو درگزر سے کام لینے والا تھا۔ فیاض بھی بہت تھا۔ ابوجعفر کے بار بار اصرار پر بھی ابومسلم خراسانی کو قتل نہ کروایا۔ کوئی بھی حاجت منداس کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔

وہ عیش وعشرت سے دور بھاگتا تھا۔ نماز، روزے اور دوسرے شعائر اسلام کا پابند تھا۔ تمام مؤرخ اس کی سادہ اور عیش وعشرت سے پاک زندگی پر رطب اللسان ہیں۔ دنیا بھر کی نعمتیں میسّر ہونے کے باوجود اس نے کبھی ان سے استفادہ نہیں کیا۔

ابوالعباس خود بھی عالم تھا اور اہلِ علم کا قدردان و مربی بھی تھا۔ علوم فنون کی سرپرستی کرتا تھا۔ اسے شعروشاعری اور موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ جب کبھی جنگ وجدل سے فرصت ملتی، وہ علماوشرفا کی محافل منعقد کرواتا۔ شعرا اور گویوں کو بڑے بڑے انعام دیتا۔

ابوالعباس نے عباسی سلطنت کے بانی ہونے کا حق ادا کیا۔ اپنی تدبیر وحکمت اور انتظامی امور میں مہارت سے بنوعباس کی سلطنت کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ 136ھ بمطابق 754ء میں ابوالعباس السفاح نے وفات پائی۔ انتقال سے پہلے اس نے اپنے بھائی ابوجعفر منصور اور اپنے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ کو بالترتیب ولی عہد مقرر کیا۔

ابوجعفر المنصور (136ھ تا 158ھ بمطابق 754ء تا 775ء)

ابوجعفر منصور دراز قامت، گندم گوں، خوب صورت شخص تھا، وہ دبلا پتلا تھا، چہرے پر گوشت کم اور گھنی داڑھی تھی۔ اس کی شخصیت انتہائی بارعب تھی، انتہائی خوش مزاج اور خوش خلق تھی جب وہ تیار ہوکر دربار میں جاتا تو انتہائی سنجیدہ مزاج ہوتا تھا۔ رعب داب کا مالک، پرہمت چہرہ اور مخالف کے دل میں اترنے والی نظر رکھتا تھا۔

برسراقتدار آتے ہی اسے نامساعد حالات، بغاوتوں اور شورشوں سے پالا پڑا۔ اپنے بھائی ابوالعباس کے دور میں بھی اس نے کمال جرات وہمت سے بنوعباس کے مخالفین کو بزورشمشیر کچلا۔ خلیفہ بنتے ہی شورشوں پر عزم وہمت سے قابو پایا۔ اس کی بہادری اور شجاعت کی داد اس کے مخالفین بھی دیتے تھے۔ الجزیرہ کے باغی جرنیل اسحاق بن عقیل نے ان الفاظ میں اس کو دادِ شجاعت دی ''منصور کو اچھی طرح آزمایا تو مجھے وہ نہایت سخت اور طاقتور دکھائی دیا اور جب میں نے اس کا مقابلہ کیا تو وہ ناقابل شکست نکلا۔''

فرقہ راوندیہ کے لوگوں نے جب اس کے محل کا محاصرہ کیا تو اس نے اکیلے ہی ان کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ وہ ہر مشکل وقت میں اپنے اوسان بحال رکھتا اور کمال حکمت عملی سے ان مصائب سے نبردآزما رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر مہم میں کامیاب وکامران رہتا۔

منصور تدبر وحکمت کی صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ ہمیشہ سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھاتا۔ اپنی اعلیٰ حکمتِ عملی اور دوراندیشی سے کسی بھی معاملے کے نفع ونقصان کو پہلے سے جانچ لیتا اس لیے بجا طور پر اسے بنوعباس کا حقیقی بانی کہا جاتا ہے۔

المنصور انتظامی معاملات میں بھی کمال مہارت رکھتا تھا۔ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد امور سلطنت میں مشغول ہوجاتا۔ دوپہر تک ملکی مسائل پر غوروخوض کرتا اور ان کے متعلق احکام جاری کرتا۔ عصر کے بعد اہل خانہ کے ساتھ وقت گزرتا۔ گھریلو مسائل حل کرتا اور ذاتی کام

سرانجام دیتا۔عشا کے بعد باہر سے آئے ہوئے مراسلات اور عرضداشتوں پر خیالات کا اظہار کرتا۔اراکین سلطنت کی آراسنتا اور ان پر غور وخوض کرتا۔اگر ان کی رائے صائب ہوتی تو ان پر عمل کرتا۔ایک تہائی رات عبادت کرتا،تہجد گزار تھا۔فجر کی نماز کی امامت بھی کرتا تھا۔ دنیا کے ساتھ ساتھ دینی امور میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔عوام کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے محکمہ جاسوسی قائم کیا جو ملک کے طول وعرض میں پوری طرح فعال تھا۔ملک میں وقوع پذیر چھوٹے سے چھوٹے واقعے سے باخبر رہتا تھا۔یہ وجہ تھی کہ ملک میں رونما ہونے والی سازشوں اور شورشوں پر بروقت قابو پالیتا تھا۔

خلیفہ منصور اپنے پیشرو ابوالعباس کی طرح حاضر دماغ تھا۔اپنے فہم وادراک، بیدار مغزی اور حاضر دماغی سے کام لے کر اس نے اپنی سلطنت کو مستحکم کرلیا اور تمام شورشوں، بغاوتوں اور فتنوں پر قابو پالیا۔

کفایت شعاری کے معاملے میں المنصور یکتائے روزگار تھا۔اپنے عمال سے ایک ایک پیسہ کا حساب لیتا تھا۔بغداد کی تعمیر کے اتنے بڑے منصوبے پر حساب کتاب سے پتہ چلا کہ پندرہ درہم کی رقم زائد خرچ ہوگئی۔منصور نے وہ رقم محاسب سے لے کر بیت المال میں جمع کروادی۔پھٹے پرانے کپڑوں کو پیوند لگا کر پہننے میں عار محسوس نہیں کرتا تھا۔اکثر کہا کرتا تھا کہ جو شخص پرانے کپڑوں کی اصلاح نہیں کرتا وہ نئے کپڑوں کا حقدار نہیں۔لوگ اس کی کفایت شعاری کو بُخل پر محمول کرتے ہیں مگر وہ بخیل نہیں تھا۔جہاں پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی بے دریغ خرچ کرتا تھا۔کفایت شعاری کی عادت کی وجہ سے اس کی وفات کے وقت ملکی خزانے میں چھ کروڑ درہم اور چودہ کروڑ دینار موجود تھے۔ملک ہر لحاظ سے ترقی کررہا تھا اور رفاہ عامہ کے کاموں پر بھی بے دریغ خرچ ہو رہا تھا۔

تمام خوبیوں کے باوجود وہ نہایت سخت مزاج تھا۔امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ جیسے جید عالموں پر کوڑے برسائے۔یہاں تک کہ ابومسلم خراسانی جیسے محسن کو بھی نہیں بخشا اور بھرے دربار میں اسے تہ تیغ کروادیا۔

ابوجعفر منصور عالم وفاضل اور بہترین خطیب تھا۔ہمیشہ مدلل اور رواں گفتگو کرتا۔اس کے دور میں بڑے بڑے علما وفقہا گزرے ہیں۔امام مالکؒ، امام جعفر صادقؒ اور امام ابوحنیفہؒ اسی دور کے درخشندہ ستارے ہیں۔منصور ہی کے دور میں غیر ملکی علمی کتب کے تراجم ہوئے۔علم کی ترویج کے لیے منصور ذاتی طور پر کوشاں رہا۔

ابوجعفر المنصور کے عہد میں ہونے والی بغاوتیں

ابوجعفر المنصور کو تخت خلافت پر متمکن ہوتے ہی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔مختلف صوبوں میں بغاوتیں برپا ہوئیں جن کو فرو کرنے کے لیے منصور کو سخت حکمت عملی اختیار کرنا پڑی۔

عبداللہ بن علی کی بغاوت

عبداللہ بن علی منصور کا چچا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ ابوالعباس نے معرکہ زاب سے قبل اسے اپنا جانشین بنانے کا اعلان کیا تھا۔چنانچہ بہت سے لوگ اس کے حامی ہوگئے اور وہ اپنے حامیوں کو لے کر نصیبین کے مقام پر پہنچ گیا۔منصور نے ابومسلم خراسانی کو اس کی

سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ ابو مسلم خراسانی نے اسے شکست دی اور نصیبین پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ بن علی بھاگ کر اپنے بھائی سلیمان کے پاس پہنچ گیا جو ان دنوں بصرہ میں تھا۔ منصور نے سلیمان کے کہنے پر اس کو امان دے دی مگر قید کر لیا۔ کہتے ہیں جس عمارت میں اسے رکھا گیا اس کی بنیادیں نمک پر اٹھائی گئی تھیں، چنانچہ بارشوں کے مہینے میں ہی عمارت مسمار ہو گئی۔ عبداللہ بن علی اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ اس مکان میں دب کر ہلاک ہو گیا۔

ابو مسلم خراسانی کی بغاوت

عباسی حکومت کے قیام میں ابو مسلم خراسانی کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے منصور خائف رہتا تھا۔ خراسان میں ابو مسلم خراسانی کے بہت حامی تھے۔ منصور کو ڈر تھا کہ ابو مسلم خراسانیوں کی حمایت سے بنو عباس کی خلافت کے لیے خطرہ بن جائے گا چنانچہ اس نے ابو مسلم کو خراسان کی امارت سے ہٹا کر مصر اور شام کی پیش کش کی۔ منصور کا خیال تھا کہ خراسان مرکز سے دور ہے۔ اگر ابو مسلم مرکز کے قریب آ جائے تو ہر لحظہ اس پر نظر رکھی جا سکتی ہے، مگر ابو مسلم نے منصور کے اس حکم کو نہ مانا اور خراسان چلا گیا۔ منصور نے اسے دربار میں بلایا مگر وہ نہیں آیا۔ بعد میں دوسرے امرا کے کہنے سننے پر دربار میں حاضر ہوا تو منصور نے پہلے تو اس کی آؤ بھگت کی اور پھر اس پر الزامات لگائے اور آخر دربار میں ہی قتل کروا دیا۔ یوں محسن کشی کا الزام اپنے سر لے کر وہ تاریخ میں رسوا ہو گیا۔

محمد بن عبداللہ اور ابراہیم بن عبداللہ کی بغاوت

عباسی حکومت شہادت حسینؓ کے انتقام کی دعوت پر قائم ہوئی تھی۔ اس حکومت کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ خلافت بنو امیہ کا نہیں بلکہ بنو ہاشم کا حق ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قبیلہ سے متعلق تھے، چنانچہ امویوں کا تختہ الٹنے کے لیے بنو عباس کے علاوہ علوی داعی بھی سرگرم رہے تھے۔ انھیں توقع یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی فاطمہؓ کی اولاد ہونے کی وجہ سے خلافت انھیں ملے گی لیکن جب ان کی توقعات کے خلاف خلافت پر بنو عباس نے قبضہ کر لیا تو انھوں نے عباسیوں کی مخالفت شروع کر دی۔ ابو العباس نے انعامات کی بارش کے ذریعے علویوں کو بغاوت سے باز رکھا لیکن منصور کے عہد میں علوی اپنی حکومت کے قیام کی دعوت لے کر میدان میں نکل آئے اور انھوں نے منصور کے عہد میں دو بغاوتیں کیں۔

اہلِ بیت میں ایک نہایت پارسا بزرگ محمد بن عبداللہ نے پہل کی۔ ان کا نام اور ان کے والد کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتا تھا اس لیے امام مہدی کے متعلق مشہور حدیث کا اطلاق آپ پر ہو سکتا تھا چنانچہ عوام نے آپ کا ساتھ دیا۔ ذاتی صفات و اخلاق کی پاکیزگی کی وجہ سے آپ کو نفس زکیہ کہا جاتا تھا۔ منصور نے آپ کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی لیکن آپ کی نقل و حرکت اس حد تک خفیہ ہوتی تھی کہ وہ گرفتار نہ کر سکا۔ آپ کے جدِ امجد حضرت حسنؓ کی تمام اولاد گرفتار کر لی گئی اور انھیں طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں۔ بالآخر آپ نے اپنی خلافت کا اعلان کر کے مکہ و مدینہ پر قبضہ کر لیا۔ منصور نے اپنے بھتیجے عیسیٰ اور ابن قحطبہ کو مقابلے پر روانہ کیا۔ نفس زکیہ نے مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کیا لیکن محاصرے کی شدت کی وجہ سے کھلے میدان میں مقابلے پر آنا پڑا۔ عباسی قوت بہت زیادہ تھی اس لیے آپ کی شکست

یقینی تھی۔آپ بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور آپ کا سر عبرت کے لیے کوفہ اور دوسرے شہروں میں پھرایا گیا۔

نفس زکیہ کے بعد ان کے بھائی ابراہیم نے بغاوت کی۔ بصرہ اور واسط پر قبضہ کے بعد وہ کوفہ کی طرف بڑھے لیکن عباسی فوج نے راستہ روک لیا اور آپ بھی اپنے بھائی کی طرح لڑتے ہوئے قتل ہوئے۔علویوں کی ان دونا کام بغاوتوں کے بعد منصور نے چن چن کر ان کو قتل کروانا شروع کیا۔ چنانچہ نفس زکیہ کے بیٹے علی عبداللہ اورحسن اور اس کے بھائی موسیٰ، یحییٰ اور ادریس گرفتار کر کے قید یا قتل کر دیے گئے۔ نفس زکیہ اپنے ذاتی کردار اور خاندان نبوت کے ساتھ تعلق کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول تھے لیکن آپ میں نسلی تفاخر بہت زیادہ تھا تاہم آپ کی بغاوت عباسی خلافت کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ تھی جس کو منصور نے کامیابی سے دبادیا۔

سندھ میں قبائلی جنگیں ازسرنو شروع ہوگئیں۔منصور نے خطرے کو بروقت محسوس کیا اور ہشام کو بھیج کر وہاں امن وامان قائم کیا گیا۔ منصور کے دور میں اور بھی بہت سی بغاوتیں رونما ہوئیں۔ان تمام بغاوتوں کو منصور نے بروقت اقدام سے ختم کر دیا اور عباسی حکومت کو ان عظیم خطرات سے بچایا جو شاید کسی اور کے بس میں نہ تھے۔

اسلامی حکومت کو داخلی معاملات میں الجھا ہوا دیکھ کر رومیوں نے بھی دوبارہ چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ بالآخر مسلمانوں نے قیصر کو جزیہ ادا کرنے پر مجبور کردیا۔اس کے ساتھ قیدیوں کا تبادلہ بھی کیا گیا۔رومیوں کے خلاف کامیابیوں سے عباسی حکومت کا وقار بحال ہوگیا۔

ابوجعفرالمنصور کا نظام حکومت

جس طرح بنوامیہ میں عبدالملک بن مروان پایہ کا حکمران تھا،اسی طرح خلافت بنوعباس کے حقیقی استحکام کا باعث ابوجعفر منصور تھا۔ منصور جب برسرِاقتدار آیا تو صوبوں کے حکام اپنے صوبوں پر پورا پورا کنٹرول رکھتے تھے۔ وہ فوجی قوت اور ملکی خزانے کو اپنی مرضی کے مطابق تصرف میں لاتے۔صوبوں کی ضروریات کے بعد کچھ بچتا تو مرکز کو بھیجتے مگر ابوجعفر نے یہ طریقہ بدل دیا۔سب محاصل پہلے مرکز میں جمع کیے جاتے اور پھر صوبوں کی ضرورت کے مطابق انھیں رقم دی جاتی۔اس طرح بیت المال میں اڑتالیس کروڑ روپیہ محاصل کی مد میں آنے لگا۔اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایک اور اصول اپنایا کہ کسی حاکم کو کسی ایک جگہ زیادہ دیر تک نہ رہنے دیتا۔ بلکہ ان کا تبادلہ کرتا رہتا اور جو لوگ زیادہ بااثر ہوتے تھے انھیں حکومت ہی سے خارج کر دیا جاتا تاکہ وہ طاقت حاصل کر کے اس کی حکومت کے لیے خطرہ نہ بنیں۔

منصور کا عہد اس لحاظ سے بنوعباس کا زریں عہد کہلاتا ہے کہ اس کے عہد خلافت میں اشیائے صرف نہایت ارزاں تھیں۔ابوجعفرالمنصور کے دور میں تجارت،صنعت وحرفت اور زراعت میں بڑی ترقی ہوئی۔اس نے دور دراز کی بنجر زمینوں کو کاشت کے قابل بنانے کا بندوبست کیا جس سے ملک میں پھلوں اور غلہ کی بہتات ہوگئی اور لوگ خوشحال ہو گئے۔

منصور کو فوج سے بہت دلچسپی تھی۔وہ خود فوجی لباس پہن کر دربار میں آتا تھا۔فوج کا معائنہ کرتا ان کی ضروریات کا خیال رکھتا۔ اس نے سرحدوں کے انتظام وانصرام میں گہری دلچسپی لی۔اس نے فوج کو تین صوبوں میں تقسیم کر دیا۔

ii-شمالی عربوں کی فوج ii-جنوبی عربوں کی فوج (یمنی) iii-خراسانیوں کی فوج

اس نے ایشیائے کوچک، آرمینیہ اور کوہستانی سرحدوں پر مضبوط قلعے تعمیر کروائے اور ان میں فوجی دستے تعینات کیے۔ فوجوں کی بھرتی، ان کی تربیت، اسلحہ کی فراہمی اور تنخواہ کی باقاعدگی کا انتظام کیا۔

منصور کے عہد میں سرکاری دفاتر کا قیام عمل میں آیا۔ دیوان خراج، دیوان فوج، دیوان موالی وغلام، محکمہ برید، دیوان رسائل، محکمہ تحقیقات مظالم، محکمہ جاسوسی، محکمہ پولیس اور محکمہ عطا و ظائف بنائے گئے۔ ان کے علاوہ غیر اقوام کے حقوق کی حفاظت کے لیے ایک مستقل محکمہ بھی بنایا گیا۔ یہ محکمہ رعایا اور گورنروں کے حالات جاننے کے لیے بنایا گیا۔ جاسوس بھیس بدل کر رعایا اور حکام کے حالات سے باخبر رہتے۔ ان جاسوسوں کی وجہ سے منصور اپنے خلاف برپا ہونے والی سازشوں، شورشوں اور بغاوتوں سے نہ صرف باخبر رہے بلکہ اپنی حکمت عملی سے مخالفین کو کچلنے میں بھی کامیاب رہتا۔

ان محکموں پر منصور نے خاص توجہ دی۔ ڈاک کے انتظام میں پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ اصلاح اور ترقی ہوئی۔ منصور خود کہتا تھا کہ حکومت کے عناصر ترکیبی میں چار عناصر نہایت اہم ہیں۔ ان کا انتخاب بہت غور سے کرنا چاہیے۔ قاضی، پولیس کا افسر، خراج کا افسر، اور ڈاک کا افسر۔ منصور ڈاک کے افسر سے جاسوسی کا کام بھی لیتا تھا۔ یہ افسر حکومت کے نظم ونسق میں اس کے دست وباز و ثابت ہوئے تھے۔ اگرچہ قاضی کا تقرر خلیفہ کی مرضی سے ہوتا تھا مگر تقرر کے بعد وہ آزاد حیثیت سے کام کرتا تھا۔ قاضیوں کے فیصلے ہمیشہ غیر جانبدار ہوتے تھے۔

ابوجعفر المنصور نے چند اراکین سلطنت کو ان کی بیش بہا خدمات کے عوض جاگیریں بھی عطا کیں اور انعامات سے بھی نوازا۔ ملک میں خوشحالی لاکر منصور نے عوام کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ محاصل کی آمد رفاہ عامہ پر خرچ کرنے کے بعد بیت المال بھرا ہوا تھا۔ جب منصور کی وفات ہوئی تو بقول مورخین خزانے میں اتنا مال تھا کہ آئندہ دس سال کے اخراجاتِ حکومت کے لیے کافی تھا۔ منصور کا عہد حکومت اسلامی علوم وفنون کی تدوین کے لحاظ سے خاص اہمیت کا حامل تھا۔

منصور نے علمی ترقی کے لیے اہم علمی کتب کے عربی زبان میں تراجم کروائے۔ منصور کا سب سے اہم اور لازوال تہذیبی کارنامہ تعمیر بغداد ہے۔ شہر کے عین وسط میں منصور کا محل تھا۔ پھر سرکاری دفاتر، اس کے بعد امرا اور اراکین سلطنت کے محلات و مکانات اور اس کے بعد بازار تھے۔

خلیفہ ہادی (169ھ تا 170ھ بمطابق 785ء تا 786ء)

منصور کے بعد اس کے بیٹے مہدی نے حکومت سنبھالی۔ مہدی نے 25 جولائی 785ء کو تینتالیس برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس نے وفات سے قبل اپنے بیٹے ہادی اور ہارون کو یکے بعد دیگرے اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ مہدی کی وفات کے بعد ہادی 25 برس کی عمر میں مسند خلافت پر متمکن ہو گیا۔

ہادی کا اصل نام موسیٰ بن مہدی تھا۔ 760ء میں پیدا ہوا۔ اس کی والدہ کا نام خیزران تھا۔ ملکہ خیزران کو ہارون الرشید کے ساتھ

بہت محبت تھی۔ ملکہ خیزران چاہتی تھی کہ مہدی، ہادی کی بجائے ہارون الرشید کو اپنا جانشین نامزد کرے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

موسیٰ بن مہدی 25 برس کی عمر میں صفر 169ھ میں مسند خلافت پر جلوہ آرا ہوا۔ صرف ایک سال تین ماہ حکومت کی اور چھبیس برس کی عمر میں 15 ربیع الاول 170 ہجری کو انتقال کر گیا۔ موسیٰ بن مہدی کی نماز جنازہ ہارون الرشید نے پڑھائی اور عیسیٰ آباد کے باغ میں سپرد خاک کیا گیا۔

ہارون الرشید

(170ھ تا 193ھ بمطابق 786ء تا 809ء)

حالاتِ زندگی

ہارون 148 ہجری بمطابق 765ء میں بمقام ''رے'' پیدا ہوا۔ خلیفہ مہدی ان دنوں خراسان اور رے کا حاکم تھا۔ منصور کو اس کی ولادت کی اطلاع اس وقت ملی جب وہ نئے دارالخلافہ بغداد میں منتقل ہو رہا تھا۔ ہارون کی پیدائش کی خبر اس کے لیے وجہ نشاط ثابت ہوئی کیونکہ اس کی پیدائش اور بغداد کی تکمیل ایک ہی دن ہوئی تھی۔ منصور فال لینے کا عادی تھا۔ اس نے اس ساعت کو خوش آئند قرار دیا۔ ہارون کی تعلیم و تربیت بڑے احسن ماحول میں ہوئی۔ اس کے دادا نے اپنی چشم بصیرت سے دیکھ لیا تھا کہ ایک دن یہ بچہ بڑا ہو کر نام پیدا کرے گا اور اس کی خوبیوں کی بدولت اسے شہرت دوام حاصل ہوگی چنانچہ منصور نے اس کی تعلیم و تربیت کی خود نگرانی کی۔ یحییٰ برمکی کو ہارون الرشید کا اتالیق مقرر کیا گیا لیکن علم حدیث کی تعلیم ہارون نے امام مالکؒ سے حاصل کی۔ ہارون کے دیگر اساتذہ بھی یگانہ روزگار تھے۔ اگرچہ اس کے اساتذہ کی فہرست خاصی طویل ہے تاہم علی بن حمزہ، مفصل اور امام مالکؒ کا نام بطور خاص لیا جاسکتا ہے۔

ہارون الرشید کو اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا۔ خوش قسمتی سے اسے اچھے اساتذہ میسر آ گئے جنھوں نے اس کی ادبی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور علم و فضل میں یکتا بنا دیا۔ تاریخ میں ہارون کی علمی و ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔ ہارون الرشید نے علم و فضل کے علاوہ فنون سپاہ گری میں بھی کمال حاصل کیا۔ اس نے اوائل عمر ہی میں فنون حرب و ضرب کی باقاعدہ تربیت حاصل کی اور کئی فوجی مشقوں میں حصہ لیا۔ اس کی فوجی مہارت کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس نے سولہ برس کی عمر میں رومیوں کے خلاف مہم بھیجی۔ اس عسکری تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ دس برس کی عمر میں کسی بھی منہ زور گھوڑے کو سرپٹ دوڑا سکتا تھا۔

ہارون عہد شباب کو پہنچا تو اس کے مزاج میں تہذیبی و ثقافتی عنصر غالب تھا۔ ہارون اپنی رضاعی ماں فاطمہ سے بہت متاثر تھا جو حسن اخلاق کے علاوہ مذہب کی دلدادہ تھی۔ اس میں بے پناہ خوبیاں تھیں۔ عہد جوانی میں ہارون کی توجہ لہو و لعب کی بجائے اتقا اور پرہیزگاری کی جانب تھی۔ اس کی شخصیت میں نکھار اور جلا پیدا کرنے میں اس کے اتالیق یحییٰ برمکی کا بڑا ہاتھ تھا۔ ہارون الرشید کی شادی اس کی خواہش کے مطابق اس زمانے میں نابغہ روزگار خاتون زبیدہ سے 781ء میں ہوئی۔ ملکہ زبیدہ خوبصورت اور خوب سیرت ہونے کے علاوہ علم و فضل، ادبی ذوق اور قرآن فہمی میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ زبیدہ کی شخصیت نے ہارون کی ذات پر اچھے اثرات مرتب کیے۔

مہدی کا انتقال ہوا تو ہارون نے ہادی کی عدم موجودگی میں اس کے لیے بیعت لی۔ یہ اقدام اس کے نیک سرشت ہونے کا بین ثبوت ہے کہ اس نے باپ کی خواہش کا احترام کیا لیکن ہادی نے برسر اقتدار آ کر ہارون کی بجائے اپنے کم سن بیٹے جعفر کو خلافت سونپنا چاہی۔ شاید ہادی اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا لیکن یحییٰ برمکی اور ملکہ خیزران کی کوشش سے وہ ایسا نہ کر سکا۔ علاوہ ازیں ہادی کی اچانک موت نے یہ مسئلہ خود بخود حل کر دیا چنانچہ 786ء میں ہادی کی وفات کے بعد ہارون الرشید تخت خلافت پر متمکن ہوا۔

شخصیت و کردار

ہارون الرشید نہایت پاکیزہ صفات اور جاذب نظر شخصیت کا مالک تھا۔ اسے دیکھنے والا گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ ہارون الرشید 23 برس کی عمر میں مسند خلافت پر جلوہ گر ہوا اور قریباً 22 برس اس عہدے پر متمکن رہ کر 809ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ اس نے اپنے دور اقتدار میں غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار کر کے عباسی خلافت کو چار چاند لگا دیے۔ اس کا دور خلافت عباسیہ کا ''سنہری زمانہ'' کہلاتا ہے۔ اگرچہ انسان ہونے کے ناطے اس کی شخصیت میں چند خامیاں بھی تھیں لیکن اس کے محاسن اس کے عیوب پر غالب تھے۔

ہارون میں انتظامی صلاحتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس نے انتظام سلطنت میں جس ذہانت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا اس سے تاریخ میں اس کو مسلمہ مقام مل گیا۔ اس نے امور سلطنت کی انجام دہی کے لیے باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنایا ہوا تھا۔ وہ ہر کام اپنے وقت پر انجام دیتا۔ اگرچہ قدرت نے اسے بے پناہ انتظامی صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہر معاملے میں اپنے وزرا، عمائدین حکومت اور دانشوروں سے مشورہ لیتا تھا۔ وہ راتوں کو بھیس بدل کر گلیوں میں بازاروں میں گشت کرتا اور رعایا کے حالات سے باخبر رہتے ہوئے مختلف اقدامات کرتا۔ عوام کی فلاح بہبود اسے دل سے عزیز تھی۔ وہ جرائم کی بیخ کنی کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کرتا۔ اس کا قول تھا کہ ''کوئی جاں گداز واقعہ رونما ہونے سے قبل ہی اس کا تدارک کر لینا چاہیے۔''

ہارون پیدائشی طور پر ایک سپاہی تھا۔ اس نے علم و ادب کے علاوہ فنون سپہ گری کی تربیت بھی حاصل کی تھی گویا وہ بہترین حکمران ہونے کے علاوہ رزم و بزم کا دھنی بھی تھا۔ اکثر معرکوں میں فوج کی قیادت کی اور اپنی بہادری کا لوہا منوایا۔

شعر و شاعری کے علاوہ ہارون الرشید کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا اور وہ شعرا کے ساتھ ساتھ موسیقاروں اور مغنیوں کی بھی سرپرستی کرتا تھا۔ خود ہارون کو بھی فن موسیقی میں خاصی مہارت تھی اور اس کے عہد خلافت میں موسیقی کو باقاعدہ ایک فن کا درجہ حاصل تھا۔ ہارون الرشید کی ذات میں جہاں بے پناہ خوبیاں تھیں وہاں اس میں ایک خامی بھی تھی۔ اس کی طبیعت میں عیش پرستی کا عنصر بھی موجود تھا۔ دربار میں ایک طرف علما، فضلا اور مذہبی شخصیتوں کا اجتماع ہوتا دوسری طرف عیش و نشاط کا اہتمام بھی کیا جاتا۔

تجارتی اور صنعتی ترقی کے لحاظ سے بھی ہارون الرشید کا دور بام عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ بغداد عباسی سلطنت کا دل تھا جو تجارتی لحاظ سے دنیا کا مرکز نگاہ تھا۔ جہاں تک صنعتی ترقی کا تعلق ہے اس میں بھی عباسی حکومت اپنے پیشروؤں سے سبقت لے گئی تھی۔ بغداد ریشمی اور سوتی کپڑے کی صنعت کا مرکز تھا۔ کاغذ سازی کی صنعت بھی فروغ پا رہی تھی۔ دجلہ و فرات کے کنارے پن چکی کی صنعت عروج پر تھی۔

تجارت اور صنعت کا فروغ استحکام سلطنت کا ضامن ضرور ہے لیکن زراعت کی ترقی بہر حال ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی

حیثیت رکھتی ہے۔خلافت عباسیہ کوخوشحالی اورآسودگی بخشنے والی اصل چیز زراعت کی ترقی ہے۔ہارون نے ملک میں نہروں کا جال بچھا دیا تاکہ لوگ زرعی لحاظ سے خوشحال ہوں۔زراعت کی ترقی سے معیشت مضبوط ہوئی اورحکومت کولگان کی مد میں کروڑوں کی آمدن ہونے لگی۔ ہارون الرشید ایک اچھا منتظم تھا۔اس نے تمام انتظامی محکمہ جات کی تنظیم نو کی۔اسے دورجدید کے دفتری نظام سے کسی صورت کم نہیں کہا جا سکتا۔ہارون الرشید نے اپنے دور کے انتہائی معتبر عالم دین امام ابویوسف کوقاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز کیا۔یہ عہدہ آج کل چیف جسٹس کے برابر ہے۔انھوں نے عباسی عہد میں قانون کی عملداری کویقینی بنایااورمعاشرتی انصاف کوفروغ دے کرظلم وتعدی کا خاتمہ کیا۔اس نے ناداروں، یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے مقرر کیے۔اثنائے راہ میں حاجیوں کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے اس نے پیدل حج کیا اورپھر مکے تک سڑکیں تعمیر کرائیں۔

ہارون علم وادب کے علاوہ سائنسی علوم کی ترقی کا بھی خواہاں تھا۔اس نے سائنسی علوم کی ترقی کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔

اہم واقعات

ہارون الرشید نے اپنے عہد میں ہونے والی بغاوتوں کونہایت بہادری سے فروکیااورعباسی سلطنت کے استحکام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔یہ اسی کاحسن انتظام تھا کہ یہ عباسی حکومت کا زریں عہد کہلایا۔اس کے عہد کے اہم واقعات مندرجہ ذیل ہیں۔

i- ہارون الرشید کے عہدِحکومت میں خاندان برامکہ کوخوب عروج حاصل ہوا۔یہ خاندان حکومت میں خاصا دخیل تھااوراعلیٰ عہدے ان لوگوں کے پاس تھے۔برامکہ نے عباسی حکومت کے استحکام میں اہم کردارادا کیا۔نظم ونسق کے قیام،امن وامان کی بحالی،علم و ادب کےفروغ اورمعاشرتی وثقافتی ترقی کے لیے برامکہ کی خدمات قابل تحسین تھیں۔

ii- ہارون الرشید نےبعض غیرملکی حکمرانوں سے سفارتی تعلقات بھی قائم کیے۔شاہ چین اورشاہ فرانس کے ساتھ ہارون کے خصوصی تعلقات تھے۔ایک بار ہارون نے شاہ فرانس کوایک ہاتھی اورایک نادر گھڑی بطورتحفہ بھیجی۔اہل فرانس گھڑی کاالارم سن کرورطہ حیرت میں پڑ گئے اورسوچنے لگے کہ شایداس میں کوئی جن چھپا ہواہے جوگھنٹی بجاتا ہے جب کچھ دن تک چابی نہ دینے کی وجہ سے الارم بند ہوگیاتولوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید گھڑی کا جن مرگیا ہے۔شہنشاہ فرانس اس تحفے کودیکھ کربڑا حیران ہواتھا۔

iii- ہارون الرشید کی متعدداولادیں تھیں مگروہ ان سب میں سے امین اور مامون سے زیادہ محبت کرتا تھا۔قابلیت اورانتظامی صلاحیتوں کے اعتبار سے مامون ولی عہدی کے لیے زیادہ موزوں تھالیکن ملکہ زبیدہ امین کوترجیح دیتی تھی کیونکہ امین زبیدہ کے بطن سے تھا۔آخر زبیدہ کی محبت انصاف پر غالب آ گئی۔ہارون الرشید نے امین کوولی عہد نامزد کردیااوراس کے بعد مامون کی دل جوئی کے لیے خراسان کاپوراصوبہ اسے دے دیااوروہاں کےفوجی افسروں سے مامون کے لیے بیعت لے لی۔

iv- خلیفہ ہادی کے زمانے میں یحییٰ بن عبداللہ کا بھائی ادریس بن عبداللہ فرار ہوکرافریقہ چلا گیا۔وہاں بربری باشندوں نے اس کا پرجوش استقبال کیااوربیعت کرکے اسے اپناامام تسلیم کرلیا۔اس نے مراکش میں آزادعلوی حکومت قائم کرلی۔ہارون الرشید کوخبر ہوئی تواس نے اپنے ایک غلام کی وساطت سے ادریس کوزہر دلوادیالیکن اس کی وفات کے بعداس کے بیٹے ادریس ثانی

نے علوی ریاست کی سربراہی سنبھال لی اور اسے مزید تقویت و وسعت دی۔ الغرض یہ ادریسی حکومت ہارون کے دائرہ اختیار سے نکل گئی۔

ہارون الرشید کے عہد میں دیگر اہم واقعات کی تفصیل یہ ہے۔

i- ہارون نے رومیوں کی شورش کے سدباب کے لیے بغداد کی سکونت ترک کر کے ''رقہ'' کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔

ii- شام اور فلسطین کے ساحلوں پر رومی بحری فوجوں کے ممکنہ حملوں کے پیش نظر ناکہ بندی کے لیے ایک بحری بیڑا تعینات کیا۔

iii- آرمینیا میں ترک جرنیل کی قیادت میں باقاعدہ فوج قائم کی گئی۔

iv- رومی سرحد پر مستقل فوج تعینات کی گئی جو ہر سال رومی علاقے پر حملہ کر کے اس کی قوت کو مفلوج کر دیتی۔ اس فوج کا سربراہ عبدالملک بن صالح تھا۔

v- قبرص کا جزیرہ جو عباسی علم داری سے نکل چکا تھا دوبارہ فتح کر لیا گیا۔

vi- ہارون الرشید نے ذمیوں کے تحفظ کے لیے الگ محکمہ قائم کیا اور امام ابو یوسف کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ذمیوں کے حقوق پورے کرنے کے لیے مفید اقدامات کیے۔

vii- شام کی سرحد پر فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور طرطوس، عین زربیہ اور ہارونیہ کی نو آبادیاں قائم کیں۔

viii- ہارون کے عہد میں نئے سکے بنوانے کا کام ہوا۔ بغداد کے ٹکسالوں میں دینار، درہم، قیراط اور حَبر وغیرہ کے سکے ڈھلوائے گئے۔ ان سکوں پر ہارون کے نام کے ساتھ جعفر برمکی کا نام بھی کندہ تھا۔

ix- تمام غیر شرعی ٹیکس ختم کر دیے اور امام ابو یوسف کی سربراہی میں نیا آئین تیار کرایا۔ شریعت اسلامی کے عین مطابق تھا۔ ہارون خلافتِ راشدہ کا نظام رائج کرنا چاہتا تھا۔

x- ہارون نے سیاست کے ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت کی ترقی کے لیے اقدامات کیے۔ عربی اور ایرانی تہذیب کی آمیزش سے ایک نیا تمدن ابھرا جس نے مسلمانوں کی شان وشوکت کو چار چاند لگا دیے۔

خاندان برامکہ

برامکہ

یہ امر باعث حیرت ہے کہ برامکہ نے عباسی دور میں اپنی فراست اور دانش مندی سے نہایت اعلیٰ مقام حاصل کیا تھا۔ وہ قریباً ربع صدی تک سیاہ وسفید کے مالک رہے مگر ان کی ابتدا اور اصلیت کے بارے میں ہمیں بہت کم مستند معلومات حاصل ہیں۔ مؤرخین نے برامکہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے ٹھوس شواہد پیش نہیں کیے۔ کہا جاتا ہے کہ برامکہ کا مورث اعلیٰ بلخ کے بدھ مندر ''نوبہار'' کا پجاری اور متولی تھا۔ بلخ ایران کا قدیم شہر ہونے کے علاوہ علم وادب اور تہذیب کا گہوارہ تھا۔ زرتشت کی مقدس آگ سب سے پہلے اسی شہر میں

روشن ہوئی۔ آتش کدہ نوبہار سے وابستگی کی بنا پر برامکہ کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔علم وفضل اور فہم و دانش میں ممتاز حیثیت رکھنے پر وزارت کا عہدہ اسی خاندان میں چلا آ رہا تھا۔

خالد برمکی

خالد برمکی کی تاریخ پیدائش اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں زیادہ معلومات مہیا نہیں ہوسکیں اور تاریخ یہ راہنمائی بھی نہیں کرتی کہ وہ کس طرح سفاح تک رسائی حاصل کر سکا۔ سفاح نے خالد کو پرانی خدمات اور اس کی اعلیٰ قابلیت سے متاثر ہو کر وزارت کا عہدہ سونپ دیا۔ یہیں سے برامکہ کے عروج کی ابتدا ہوتی ہے۔ وہ نہایت ذہین اور مدبر تھا اور معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اسی کے مطابق عمل کرتا تھا۔ اس نے 163 ہجری میں وفات پائی۔

یحییٰ برمکی

یحییٰ برمکی اپنے باپ خالد برمکی کی طرح عقل مند، دوراندیش اور اعلیٰ پائے کا منتظم تھا۔ وہ 119 ہجری میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے ہوئی۔ اس نے جلد ہی اپنی خداداد ذہانت کے بل بوتے پر مروجہ علوم میں دسترس حاصل کر لی۔ خلیفہ اس کی ذہانت سے بے حد متاثر تھا۔

ہادی کی اچانک وفات کے بعد ہارون الرشید مسند خلافت پر بیٹھا۔ ہارون نے اقتدار ملتے ہی یحییٰ کو وزارت کا قلمدان سونپ دیا۔ یحییٰ نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کاروبار سلطنت احسن طریقے سے چلایا۔ اس نے انتظام سلطنت کے ساتھ ساتھ علم وادب کے فروغ کے لیے بھی کئی اقدامات کیے۔ یحییٰ نے علم و ادب کے ساتھ ساتھ موسیقی اور دوسرے فنون کی سرپرستی بھی کی۔ دربار میں ادبا، شعرا اور موسیقار بھی موجود رہتے تھے اور انعام و اکرام سے نوازے جاتے۔ یحییٰ کے چار بیٹے تھے جن کے نام بالترتیب فضل، جعفر، موسیٰ اور محمد تھے یہ چاروں علم وفضل اور فیاضی میں یکتا تھے۔

فضل برمکی

فضل برمکی یحییٰ کا بیٹا تھا۔ ہارون نے بچپن میں یحییٰ کی بیوی یعنی فضل کی ماں کا دودھ پیا تھا اس لیے فضل کو اپنا رضائی بھائی تصور کرتا تھا۔ فضل اپنے بھائیوں میں جس طرح عمر میں بڑا تھا۔ اسی طرح علم و دانش، معاملہ فہمی اور اوصاف و کمالات میں بھی فوقیت رکھتا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت بھی ہارون کی طرح ہوئی اور اس نے قصرِ خلافت میں زیادہ وقت گزارا۔ ابتداً وہ امور سلطنت میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا رہا لیکن بعد ازاں اس نے مختلف مہمات میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔

یحییٰ نہایت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے عہد وزارت فضل کو سونپ دیا۔ فضل نے ملک کا انتظام احسن طریقے سے سنبھالا۔

جعفر بن یحییٰ

جعفر بن یحییٰ نے جید علماعصر سے تعلیم حاصل کی اور جلد ہی حد کمال کو پہنچ گیا۔ فصاحت و بلاغت، صرف و نحو، انشا وادب میں اس کا کوئی

جواب نہ تھا۔ اس کی فراست، فہم ودانش اور حاضر جوابی مثالی تھی۔ انھیں اوصاف کی بنا پر وہ ہارون سے قریب تر ہوگیا اور دربارشاہی میں اثر ورسوخ حاصل کرلیا۔ ہارون سے اس کی دوستی تھی اور دونوں قریباً ایک جیسا لباس پہنتے تھے۔ جعفر اپنے اوصاف کی وجہ سے ہارون کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ 175 ہجری میں جعفر کو مصر کا حاکم بنا کر بھیجا گیا مگر ہارون اس کی جدائی برداشت نہ کرسکا۔ وہ چند ماہ بعد واپس بلا لیا گیا۔ بعدازاں جعفر کو افریقہ اور خراسان کی ولایتوں پر مامور کیا گیا لیکن وہ خود بغداد میں ہارون کے پاس ہی رہا اور انتظام سلطنت میں مشورے دیتا رہا۔ ہارون نے مامون کی اتالیقی اس کے سپرد کردی۔

جعفر کو فنِ تعمیر سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ اس نے دو کروڑ روپے کی خطیر رقم سے بغداد میں ایک عالی شان محل تعمیر کرایا جو فنِ تعمیر کا نادر نمونہ تھا۔

موسیٰ بن یحییٰ برمکی

موسیٰ اپنے تمام بھائیوں میں بہادر اور حوصلہ مند تھا۔ وہ فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور نہایت شان وشوکت سے زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک بار علی بن عیسیٰ خراسان کے معزول والی نے ہارون سے موسیٰ کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اس نے روسا کو بلا وجہ میرے خلاف بھڑکایا تھا۔ ہارون موسیٰ بن یحییٰ سے بدظن ہوگیا۔ ہارون نے اسے قید کرلیا۔ یحییٰ نے ضمانت دے دی اور موسیٰ کو قید سے رہائی مل گئی۔

برامکہ نے بنوعباس کے عہد میں وہ عروج حاصل کیا کہ ان کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہ ہل سکتا تھا لیکن جیسا کہ قانون قدرت ہے۔ ہر کمالے را زوالے۔ اسی طرح برامکہ بھی عروج سے پستی میں آ گرے۔ جتنا عروج زیادہ تھا زوال بھی اتنا ہی شدید ہوا۔

زبیدہ اپنے حسن وسیرت کے سبب ہارون کے نہایت قریب تھی۔ ہارون اکثر سیاسی معاملات میں زبیدہ کی رائے کو فائق سمجھتا تھا۔ زبیدہ چاہتی تھی کہ ہارون کے بعد مسند خلافت امین کو عطا کی جائے کیونکہ امین زبیدہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا لیکن جعفر برمکی جو ایک بااثر وزیر تھا وہ امین کی بجائے مامون کو ولی عہد بنوانا چاہتا تھا کیونکہ وہ مامون کا اتالیق رہا تھا۔ یوں ملکہ زبیدہ اور برامکہ میں ٹھن گئی اور یہی چیز برامکہ کے زوال کا باعث بنی۔ برامکہ پوری عباسی سلطنت پر چھائے ہوئے تھے اور دولت واقتدار کے نشے میں سرشار ہوکر متکبر ہوگئے تھے۔ حد یہ تھی کہ خلیفہ وقت کو ان کے طرزِ عمل نے ایسا برگشتہ کردیا کہ وہ ان کو ختم کرنے کے درپے ہوگیا۔ برامکہ اپنے زوال کی حد کو پہنچ گئے۔ 187 ہجری میں ہارون نے جعفر برمکی کو قتل کرادیا۔ یحییٰ اور فضل کو قید کروادیا اور ان کی تمام جائیداد اور اثاثہ جات وغیرہ ضبط کرلیے گئے۔ دونوں برمکی قید وبند کی سختیاں جھیلتے جھیلتے انتقال کرگئے۔

مامون الرشید (198ھ تا 218ھ بمطابق 813ء تا 833ء)

193ھ بمطابق 809ء میں ہارون الرشید نے وفات پائی۔ وفات سے پہلے اپنی وصیت میں اپنے تینوں بیٹوں امین، مامون اور قاسم کو یکے بعد دیگرے ولی عہد نامزد کیا۔ مگر نسلی برتری کی بنیاد پر امین نے مامون کی ولی عہدی کو منسوخ کرتے ہوئے اپنے بیٹے موسیٰ کو ولی عہد نامزد کیا۔ چنانچہ مامون کو اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لیے امین کے خلاف جنگ کرنا پڑی اور امین بہترین فوج کے ہوتے ہوئے

بھی شکست سے دوچار ہوا۔

198ھ میں 24 سال کی عمر میں امین کو قتل کر دیا گیا اور اس طرح بغداد پر مامون کا قبضہ ہو گیا۔ جمعہ کے روز طاہر بن حسن نے مسجد میں داخل ہو کر مامون کے نام کا خطبہ پڑھا اور اہلِ شہر کے لیے عام معافی کا اعلان کیا۔

مامون الرشید 15 ربیع الاول 170 ہجری کو جمعہ کے دن پیدا ہوا۔ اس کی ولادت کی رات بھی عجیب تھی جس میں ایک تو خلیفہ ہادی نے وفات پائی دوسرا ہارون مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوا اور تیسرا خود مامون پیدا ہوا جس کی قسمت میں بڑے ہو کر مامون الرشید اعظم ہونا لکھا تھا۔ ہارون الرشید نے مبارک فالی کے اعتبار سے اس کی پیدائش کو مبارک خیال کیا اور اس کا نام ''عبداللہ'' رکھا۔ مامون کی ماں ایرانی نژاد کنیز تھی جس کا نام مراجل تھا۔

مامون کے دورِ خلافت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور 198 ہجری سے 203 ہجری تک کا ہے جس میں دارالخلافہ مرو تھا اور حکومت کی بھاگ ڈور فضل بن سہل کے ہاتھ میں تھی۔

دوسرا دور 203ھ سے شروع ہو کر 218ھ تک ہے۔ اس عرصہ میں مامون مستقل طور پر بغداد میں رہائش پذیر رہا اور فضل بن سہل کا خاتمہ کر کے تمام امورِ سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

مامون الرشید کے کارنامے

مامون الرشید کے عہدِ حکومت کو مورخین نے بنو عباس کا سنہری زمانہ قرار دیا ہے۔ یہ دور فی الحقیقت علمی، سائنسی، فنی، معاشرتی ترقی اور ادبیات کے لحاظ سے کامرانیوں کا دور ہے۔ ہارون الرشید نے جس ترقی کی ابتدا کی تھی، مامون نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی بدولت اسے حدِ کمال تک پہنچا دیا۔

مامون الرشید نے انصاف کا بول بالا کیا۔ وہ عدل و انصاف کے سلسلے میں کسی رعایت کا قائل نہ تھا اس کے دورِ خلافت میں عدلیہ کو مکمل آزادی حاصل تھی۔

یہ درست ہے کہ مامون کے عہد کا ابتدائی حصہ بدامنی اور بغاوتوں کا مرکز رہا لیکن اس کے حسنِ تدبر سے رفتہ رفتہ ملک میں امن و سکون اور خوشحالی کا درخشندہ باب شروع ہوا۔ بغاوتوں کا قلع قمع ہو گیا اور مخالف قوتیں ایک ایک کر کے دم توڑ گئیں۔ تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ لوگوں کی زندگی سکون سے عبارت ہوئی اور آسودگی اور خوشحالی نے عوام کو مطمئن کر دیا۔ مامون الرشید بہترین منتظم اور امورِ سلطنت سے کماحقہٗ واقف تھا۔ اس نے امورِ مملکت کی انجام دہی کے لیے مجلسِ مشاورت تشکیل دی۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کی صلاحیتوں سے بھی فائدہ اٹھایا اور انھیں مجلسِ مشاورت کا رکن بنایا۔

مامون الرشید کا عہد اقتصادی لحاظ سے خوشحال تھا۔ تجارت، زراعت اور صنعت ترقی پر تھی۔ عوام کو اشیائے ضرورت سستے داموں مہیا ہوتی تھیں۔ حکومت کا خزانہ بھرپور تھا اور خراج کی رقم سے ہر وقت مالا مال رہتا تھا۔ مسلمان تاجر یورپ، افریقہ ایشیا اور چین کی منڈیوں پر چھائے ہوتے تھے۔

مامون نے ملکی سرحدوں کے دفاع کو اولیت دی۔محکمۂ دفاع کی تنظیم نو کی۔فوج کو جدید اسلحے سے لیس کیا۔مامون کے عہد میں فوج کی تعداد دو لاکھ تھی۔قبل ازیں کسی عباسی خلیفہ نے اتنی تعداد میں فوج نہیں رکھی۔فوج کے جملہ مصارف حکومت برداشت کرتی تھی۔مامون احتساب کے معاملے میں بہت سخت تھا۔اس نے اس جانب خصوصی توجہ دی اور خبر رسانی کے نظام کو بہتر بنایا۔مامون کے مقرر کردہ محتسب بھیس بدل کر گلی کوچوں کا چکر کاٹتے اور مختلف اجتماعات میں شریک ہوتے۔وہ اس بات کا بھی جائزہ لیتے کہ کہیں کوئی کام خلاف شرع تو نہیں ہو رہا۔مختلف ناپ تول کے پیمانے بھی چیک کرتے تھے۔مامون نے واقعہ نگار اور قصہ نویس بھی مقرر کر رکھے تھے جو خلیفہ کو پل پل کی خبریں فراہم کرتے تھے۔

مامون علم و فضل میں یکتا تھا۔اس کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیے جانے والے اساتذہ بھی یگانۂ روزگار تھے۔مامون کی ماں چونکہ ایرانی نژاد تھی اس لیے اس نے فارسی ادب کو بھی خوب ترقی دی۔

مامون نے علم و ادب کی خوب سرپرستی کی۔سائنسی علوم کے فروغ کے لیے بیشتر اقدامات کیے اس نے بغداد میں شام اور دمشق کے قریب رصد گاہیں قائم کیں۔جہاں علمِ ہیئت کے ماہرین مختلف آلات کی مدد سے اجرامِ فلکی کا مطالعہ کرتے تھے۔مامون نے یونان، اٹلی، سسلی اور اسکندریہ کا کوئی علمی سرمایہ ایسا نہیں چھوڑا جو ترجمے کے ذریعے عربی زبان میں منتقل نہیں ہو گیا۔زمین کا محیط معلوم کیا گیا۔

ہارون الرشید کا قائم کیا ہوا بیت الحکمت موجود تھا جس میں قریباً ہر زبان کے مترجم موجود تھے اور فنون و حکمت سے متعلق تصنیفات کے عربی زبان میں ترجمے کرتے تھے۔اس کے عہد میں جن کتابوں کے ترجمے ہوئے وہ فارسی، یونانی، شامی اور کالدی زبانوں کی تھیں۔

مامون الرشید کا دور تدوینِ حدیث، فقہ اور تالیفِ تاریخِ اسلام کے لحاظ سے سنہری زمانہ ہے۔اس زمانے میں علمائے دین نے اپنی ذاتی کوششوں سے اسلامی علوم کو خوب فروغ بخشا۔امام بخاریؒ، سفیان ثوریؒ، قاضی یحییٰؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اسی دور میں موجود تھے۔

مامون کے عہد کا عظیم کارنامہ دوربین کی ایجاد بھی ہے۔دوربین کا موجد ابوالحسن ہے جو ایک مشہور ہیئت دان تھا۔

مامون نے 18 رجب 218ھ بمطابق 833ء کو وفات پائی۔اسے سرطوس کے مقام پر دفن کیا گیا۔مرنے سے پہلے مامون نے اپنی اولاد کو نظر انداز کر کے اپنے بھائی معتصم کو ولی عہد نامزد کر دیا۔

خلیفہ معتصم باللہ (218ھ تا 227ھ بمطابق 833ء تا 842ء)

معتصم کو خلیفہ مثمن کہا جاتا ہے۔آٹھ کا ہندسہ اس کی پوری زندگی پر محیط رہا۔وہ ہارون کی آٹھویں اولاد تھا۔اس کا سن پیدائش 180 ہجری تھا۔218 ہجری میں اسے خلافت ملی۔بنو عباس کا آٹھواں خلیفہ تھا۔اس کی عمر 48 سال تھی۔اس کی وفات کے وقت آٹھ لڑکے اور آٹھ لڑکیاں تھیں۔اس کی پیدائش کا برج آٹھواں تھا۔اس نے آٹھ محلات تعمیر کروائے۔اس کے ترکے میں آٹھ لاکھ دینار، آٹھ لاکھ درہم، آٹھ ہزار گھوڑے، آٹھ غلام اور آٹھ ہزار لونڈیاں شامل تھیں۔سپاہی خلیفہ تھا، بزمِ رقص و سرود سے زیادہ اسے جنگ و مال سے دلچسپی تھی۔ملکی

انتظام وانصرام بھی اس کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ حکومت کا رعب و دبدبہ بڑھانا اور جنگی مناظرے سے لطف اندوز ہونا بھی اس کے اہم شوق تھے۔ اس کے سالانہ بجٹ کا زیادہ حصہ عسکری قوت کے اضافے اور اسلحے پر خرچ ہوتا تھا۔

خلیفہ معتصم نہ تو خود پڑھا لکھا تھا اور نہ ہی اس کے وزرا پڑھے لکھے تھے۔ اس کے وزیر فضل بن مروان اور احمد بن عمار علم و دانش سے بے بہرہ تھے مگر پھر بھی اپنے بھائی اور باپ کی طرح علم و فنون کی سرپرستی کرتا رہا۔ الکندی جیسے فلسفی اور مشاہدے نے اس کے دربار میں جگہ پائی۔ دوسرے اہل علم و فن بھی اس کے دربار سے مستفید ہوتے رہے۔ معتصم کے دور میں جتنی بھی اندرونی اور بیرونی بغاوتیں ہوئیں اس نے اپنی بہترین حکمت عملی سے فرو کر دیں۔ مملکت کے انتظام وانصرام میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح معتصم نے بھی اپنی مملکت کی حدود میں بہت وسعت پیدا کی۔ قیصر روم کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں اور فتوحات حاصل کیں۔ اتنی بہادری، جوانمردی اور مدبّرانہ حکمتِ عملی کی مثال پورے بنو عباس میں نہیں ملتی۔

معتصم نے بغداد کی بجائے سامرا کا نیا شہر بسا کر اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس شہر میں ترک افواج کے لیے بیرکیں، عالی شان مکانات، گھوڑوں کے اصطبل اور شاہی محلات تعمیر کروائے۔ خلیفہ معتصم باللہ نے عربوں اور ایرانیوں کو چھوڑ کر ترکوں کی سرپرستی کی۔ یہ بڑی بہادر قوم تھی۔ اس فوج کی مدد سے خلیفہ نے بہت سی فتوحات حاصل کیں اور بغاوتیں کچل ڈالیں، مگر یہ اقدام آخر کار عباسیوں کے لیے مضر ثابت ہوا۔ خلیفہ کو زمین کی آبادکاری کا خبط تھا۔ اس نے لاکھوں ایکڑ اراضی قابل کاشت کروائی۔ زراعت کو ترقی دی۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ زمین کی آبادکاری سے خراج بڑھتا ہے۔ ملکی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے لیے روزگار بڑھتا ہے اور عوام خوش حال ہوتے ہیں۔

خلیفہ معتصم باللہ بہت صحت مند اور طاقتور شخص تھا۔ انتہائی نڈر اور بیباک تھا۔ اس کا جسم انتہائی مضبوط تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تاریخ دان اسے سپاہی خلیفہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ معتصم کا باپ ہارون الرشید خود بے حد پڑھا لکھا شخص تھا۔ عالموں کا قدردان تھا مگر اس کی انتہائی کوشش کے باوجود معتصم پڑھائی سے دور رہا۔ اسے شروع ہی سے پڑھائی لکھائی سے لگاؤ نہ تھا۔

اگرچہ معتصم خود ان پڑھ تھا۔ تمام عمر تعلیم سے بے بہرہ رہا مگر وہ علم و ادب کا قدردان تھا۔ عالموں اور فاضلوں کی ہر طرح سرپرستی کرتا تھا۔ علم کی ترویج میں دلچسپی رکھتا تھا۔ معتصم باللہ اپنی ذاتی زندگی میں بے حد سادہ طبیعت کا مالک تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح خلافت کا وقار و دبدبہ رکھنے کے لیے دربار میں سنجیدہ و پُروقار ہوتا تھا۔ دربار کے آداب کو ملحوظ رکھتا تھا۔ معتصم بہت مہمان نواز تھا۔ اس کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔

خلیفہ معتصم بھی اپنے پیشرو خلفا کی طرح معتزلہ عقیدے کا پیروکار تھا۔ غیر معتزلی لوگوں کے لیے بہت سخت تھا۔ ان سے بحث و مباحثہ بھی نہیں کرتا تھا۔ معتزلہ کے عقائد کے خلاف بات بھی نہیں سن سکتا تھا۔ خلق قرآن کے منکرین کو عبرت ناک سزائیں دیتا تھا۔ کئی علما اس وجہ سے قتل کروا دیے۔ امام احمد بن حنبلؒ جیسے جید عالم کو خلق القرآن سے انکار پر کوڑے مارے گئے مگر ان کے قدم اسلام کی راہ سے بالکل نہیں ڈگمگائے۔

معتصم نے 5 جنوری 842ء کو وفات پائی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابوجعفر ہارون واثق کے لقب سے تخت خلافت پر بیٹھا۔

مشقی سوالات

1۔ مندرجہ ذیل سوالات کے تفصیلی جواب دیں۔

i- ابوالعباس عبداللہ السفّاح کی شخصیت کے منفی اور مثبت پہلوؤں کا جائزہ لیں۔

ii- نفسِ ذکیہ کون تھے؟ انھوں نے بنوعباس کی حکومت کے خلاف کیوں اور کیسے بغاوت کی؟

iii- ابوجعفر المنصور کا عہد بنوعباس کا عہد زریں کیوں کہلاتا ہے؟ وجوہات لکھیں-

iv- یہ کس حد تک درست ہے کہ ہارون الرشید عباسی خاندان کا سب سے بڑا حکمران تھا؟ ثابت کریں۔

v- برامکہ کون تھے؟ ان کے زوال کی وجوہات لکھیں۔

vi- مؤرخین نے کس بنا پر ہارون الرشید کے عہد کو عباسی خلافت کا سنہری زمانہ قرار دیا ہے؟

vii- مامون الرشید کے عہد حکومت کا مختصر جائزہ لیں۔

viii- ابوجعفر المنصور کی سیرت و کردار پر ایک جامع نوٹ لکھیں۔

2- درج ذیل کے مختصر جواب تحریر کریں۔

i- عباسی تحریک سے کیا مراد ہے؟

ii- بنو ہاشم کو مکہ میں کیوں ممتاز حیثیت حاصل تھی؟

iii- بنوعباس کون تھے؟

iv- محمد بن علی عباس نے عباسی تحریک کو کیسے منظم کیا؟ دو پوائنٹ تحریر کریں۔

v- ابوالعباس نے حکومت میں جو انتظامی تبدیلیاں کیں ان میں سے دو تحریر کریں۔

vi- ابوالعباس نے کوفہ سے اپنا دارالخلافہ کیوں بدلا؟

vii- عباسی حکومت کے قیام کی بنیاد کون سا نظریہ تھا؟

viii- اشیائے صرف کے لحاظ سے منصور کا عہد کیوں زریں عہد تھا؟

ix- ابومنصور نے فوج کو کن تین حصوں میں تقسیم کیا؟

x- ابومنصور کے مطابق حکومت کے کون سے چار عناصر اہم ترین ہیں؟

xi- ابومنصور نے کس وجہ سے اپنے بیٹے ہارون کی پیدائش کو نیک خیال کیا؟

xii- ہارون الرشید کی رحم دلی اور عفو و درگزر کا ایک واقعہ لکھیں۔

xiii- مؤرخین ہارون الرشید کو خلافت عباسیہ کا آفتاب کیوں کہتے تھے؟

xiv- ابوالمنصور نے علمی ترقی کے لیے کیا اقدامات کیے؟

-xv یحییٰ برمکی کے چار بیٹوں کے نام تحریر کریں۔

-3 صحیح اور غلط کی نشاندہی کریں۔

-i ابو مسلم خراسانی عباسی تحریک کا بنیادی کردار تھا۔

-ii عباسیوں نے حمیمہ کو عباسی تحریک کا مرکز نہیں بنایا۔

-iii ابوالعباس عبد اللہ کو السفّاح کا لقب اس کے مظالم کی وجہ سے دیا گیا۔

-iv ابوالعباس عبد اللہ نے ہاشمیہ کا شہر آباد کیا۔

-v ابو جعفر المنصور انتظامی معاملات میں کمال مہارت رکھتا تھا۔

-vi ہارون الرشید ''رے'' کے مقام پر 148ھ بمطابق 765ء کو پیدا ہوا۔

-vii تاریخ میں ہارون الرشید کے دورِ حکومت کو ''سنہری زمانہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

-viii مامون الرشید کی ماں ایرانی نژاد تھی جس کا نام مراجل تھا۔

باب 9

بنُو عباس کے کارہائے نمایاں

عباسی نظام حکومت کی کامیابی اس حقیقت میں مضمر تھی کہ اس میں نسلی تفاوت نہیں پایا جاتا تھا۔ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں تھی۔ نومسلموں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ان کو حکومت کے مختلف شعبوں میں بلند مرتبے دیے جاتے تھے۔ جزیہ صرف غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا۔ نومسلموں سے جزیہ لینے کی مذموم رسم ختم کر دی گئی تھی۔ اس سے مفتوحہ قوموں میں عباسی حکومت بہت مقبول ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی نہایت اہم ہے۔ عباسی دور میں خلافت کو مذہبی رنگ دیا گیا تھا۔ عباسی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے چچا کی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو خلافت کے جائز وارث سمجھتے تھے۔ عباسی نظام کی کامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں عدلیہ کو انتظامیہ سے بالکل آزاد رکھا گیا تھا۔ پورا انتظام قاضی القضاۃ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ خلفا اور حکمران قاضیوں کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔

بنوعباس کا فوجی انتظام

فوجی امور میں خلیفہ مختار مطلق ہوتا تھا وہ جو تبدیلی چاہتا کر سکتا تھا لیکن عملاً تمام انتظام دیوان الجند کے ذمہ تھا۔ اس دیوان کا انچارج ایک وزیر ہوتا تھا جو ہر اہم معاملے میں خلیفہ سے مشورہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ امیر العساکر کا عہدہ بھی موجود تھا لیکن امیر العساکر اپنے دستے کے علاوہ فوج پر کوئی اختیار نہیں رکھتا تھا۔ امیر العساکر ہونے کی معنی صرف یہ تھے کہ وہ فوج کا سب سے بڑا افسر ہے اور خلیفہ اس کی بہت قدر کرتا ہے۔ خلیفہ کو اختیار ہوتا تھا کہ جب کوئی مہم درپیش ہو جس کو چاہے مہم کا انچارج بنا کر بھیج دے۔

عباسی فوج کے دو حصے تھے۔ ایک باقاعدہ تنخواہ دار مستقل فوج اور دوسری رضا کار فوج۔ رضا کار فوج ان مسلمان مجاہدین پر مشتمل ہوتی تھی جو دشمنان اسلام کے خلاف لڑنے کے لیے ازخود اپنے آپ کو پیش کرتے تھے۔ ان مجاہدین کو راشن مفت ملتا تھا اور مال غنیمت کا ایک حصہ ان میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ دوران جنگ ان کے بیوی بچوں کو حکومت کی طرف سے وظائف ملتے تھے۔ یہ فوج صرف دشمنان اسلام کے خلاف لڑتی تھی باہمی جنگوں میں بالعموم حصہ نہیں لیتی تھی۔ معرکہ ختم ہوتے ہی یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے تھے۔ اس لیے خلیفہ کے لیے یہ فوج پوری طرح سے قابل اعتماد نہیں تھی۔

باقاعدہ فوج میں عام سپاہی کو ابتدائی عباسی دور میں نو سو ساٹھ درہم سالانہ ملتے تھے لیکن ہارون نے یہ تنخواہ گھٹا کر سات سو ساٹھ درہم سالانہ مقرر کی لیکن امین و مامون کی باہمی کشمکش کے دوران یہ تنخواہ پھر نو سو ساٹھ درہم کر دی گئی۔ تنخواہ میں کمی اس وقت کی جاتی تھی جب زمانہ امن ہوتا تھا اور چیزیں سستی ہو جاتی تھیں۔ جو سپاہی محاذ پر ہوتے تھے انھیں تنخواہ عام سپاہیوں سے زیادہ ملتی تھی۔

فوج چھ حصوں میں منقسم ہوتی تھی:

i- پیدل ii- سوار iii- تیرانداز iv- آتش باز

v- نقاب (فصیل میں نقب لگانے والے) vi- خدام (خدمت گزار)

فوج کا خفیہ پولیس کا شعبہ بھی بہت مستعد ہوتا تھا۔ دشمن کی فوج کی نقل و حرکت اور عزائم معلوم کرنا اس کے فرائض تھے۔ بار برداری کا شعبہ الگ تھا جو اسلحہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا تھا۔

عباسی فوجیں جہاں کہیں پڑاؤ کرتی تھیں اپنے لشکر کے گرد خندق کھود لیتی تھیں تاکہ اچانک حملہ نہ ہو سکے۔ ایرانی فوجیں خاص طور پر خندق کے استعمال کے بارے میں بہت ماہر تھیں۔ فوج کی بھرتی بالعموم ان اقوام میں سے کی جاتی تھی جو حکومتِ وقت کی حامی ہوں۔ دورِ عباسی کے ابتدائی دور میں عربوں پر اعتماد کم ہو گیا تھا۔ اس لیے ابتدائی خلفا نے زیادہ تر خراسان و ایران سے فوجیں بھرتی کیں تاہم عربوں کی کافی تعداد فوج میں موجود تھی۔ امین الرشید نے عرب عناصر کے بل بوتے پر حکومت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے عہد میں عربوں کو پھر سابقہ اہمیت حاصل ہو گئی لیکن مامون الرشید کی فتح کے نتیجہ میں عرب امورِ سلطنت سے تقریباً بے دخل ہو گئے۔ معتصم نے عربوں کی ایک الگ فوج ترتیب دی جس کا نام مغاربہ رکھا گیا۔ یہ فوج نہایت قلیل التعداد اور کمزور تھی۔ معتصم کے دور تک خراسانی و ایرانی عباسی فوج پر چھائے رہے لیکن معتصم نے ان کی قوت توڑنے کے لیے ترک فوج بھرتی کی۔ اس فوج کا اقتدار اس وقت رہا جب تک کہ خود خلیفہ کی قوت کمزور اور سلاطین کی قوت مضبوط تر نہیں ہو گئی۔ بنو عباس نے بحری فوج کی طرف بھی توجہ دی۔ بنو امیّہ نے نیوی قائم کر رکھی تھی لیکن ابتدائی عباسی خلفا کو داخلی مشکلات کی وجہ سے اس کی طرف توجہ دینے کا موقعہ نہ ملا۔ ہارون الرشید نے بحری بیڑے کو تقویت دی اور اس کے ذریعے کریٹ اور قبرص فتح کیے۔ عہد مامون میں اغلبیہ بحری بیڑے کی قوت کی وجہ سے بحری تجارت بھی کی جاتی تھی۔ بحری قطب نما کی ایجاد بھی ہو چکی تھی اس لیے دور دراز علاقے دریافت کیے جا رہے تھے۔

ایرانی نظامِ حکومت کی نقل میں عباسیوں نے اپنے دربار میں وزارت کا منصب قائم کیا اس منصب پر بالعموم نہایت قابل اور فاضل اشخاص کا تقرر کیا جاتا تھا۔ بسا اوقات حکومت کے تمام امور وزیر ہی سرانجام دیتا تھا، سوائے ان افسروں کے جو خود خلیفہ مقرر کرتا تھا، باقی سب کی معزولی کا اختیار وزیر کو حاصل تھا۔ وزیر قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں بھی سنتا تھا۔ اپنے فرائض کے اعتبار سے وزیر کی ذمہ داری نہایت اہم تھی۔ اسے ایک طرف خلیفہ کو راضی رکھنا ہوتا تھا اور دوسری طرف عوام کو بھی خوش رکھنا اس کے فرائض میں شامل تھا تاہم بعض لائق وزرا نے حکومت کے سیاہ و سفید پر قبضہ کر کے خلفا کو عملاً بے دخل کر دیا تھا اور بعض وزرا کو اس کوشش میں اپنی جانیں بھی گنوانی پڑیں۔ عباسی خلفا نے حاجب کا منصب بھی قائم کیا۔ حاجب شاہی محافظ دستے کا انچارج ہوتا تھا اس لیے نہایت قابل اعتماد آدمیوں کو اس منصب پر مقرر کیا جاتا تھا۔ وہ خلیفہ کی طرف سے عوام کی شکایات بھی سنتا تھا۔ غیر ملکی سفیروں کو دربارِ خلافت میں پیش کرنا بھی اس کا فرض تھا۔

دارالخلافہ کی پولیس کا افسر صاحب الشرطہ کہلاتا تھا۔ دارالخلافہ میں امن قائم رکھنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ وہ جیل خانہ جات کا بھی انچارج ہوتا تھا۔ حکومت کا کام چلانے کے لیے مختلف شعبہ جات قائم کیے تھے جن کی تعداد بارہ تھی۔ ان میں سے مشہور دیوان الجند

یعنی محکمہ دفاع، دیوان الخراج (وزارت خزانہ) دیوان البرید (شعبہ ڈاک وخفیہ پولیس) دیوان الرسائل (شعبہ احکام شاہی) اور دیوان الخاتم (شعبہ شاہی مہر) تھے۔

صوبائی حکومت

انتظامی سہولت کے لیے ملک مختلف صوبوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ ان صوبوں میں افریقہ (مغرب) مصر، شام و فلسطین، حجاز (بشمول تہامہ و مرکزی عرب)، یمن، بحرین وعمان الصنا العراق (براہ راست خلیفہ کے ماتحت) جزیرہ، آذر بائیجان، عراق العجم، فوزستان، فارس، کرمان، مکران، سیستان، آرمینیا، خراسان، خوارزم، صغد (سمرقند) اور فرغانہ وغیرہ شامل تھے۔

صوبوں کے شعبہ جات

ہر صوبے میں انتظامی سہولت کے مندرجہ ذیل شعبہ جات ہوتے تھے۔

i- **دیوان الخراج:** حکومت کی آمد وخرچ کا اہتمام اور حساب اس شعبے کے فرائض میں داخل تھا۔

ii- **دیوان الرسائل:** صوبہ اور مرکز کے درمیان خط و کتابت نیز ماتحت افسروں کے نام احکام اس شعبہ کے ذریعے سے جاری ہوتے تھے۔

دیوان الدوام: اس محکمہ کا کام حسابات کی پڑتال کرنا تھا۔

دیوان البرید: سرکاری خطوط کو ایک جگہ سے بحفاظت دوسری جگہ پہنچانا اس شعبہ کی ذمہ داری تھی۔

دیوان الضیاع: سرکاری املاک کی نگہداشت اس شعبہ کی ذمہ داری تھی۔

عدلیہ کا نظام

عباسی حکومت کی ایک بہت بڑی خاصیت عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی تھی۔ عدلیہ کا انتظام قاضی القضاۃ کے ماتحت ہوتا تھا۔ ماتحت قاضیوں کی تقرری اس کے حکم سے عمل میں آتی تھی۔ ہر صوبے میں ایک بڑا قاضی مقرر کیا جاتا تھا اور ہر شہر میں قاضی معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے موجود ہوتے تھے۔ عدلیہ کی اس آزادی ہی کے سبب سے امام ابو یوسفؒ جیسے بزرگ عباسی دور میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوئے۔

معاشی نظام

حکومت کے ذرائع آمدن حسب سابق مال غنیمت، زکوٰۃ، عشر، جزیہ، خراج اور غیر ملکی مال پر ٹیکس وغیرہ تھے، البتہ مال غنیمت کا خُمس سرکاری خزانے میں نہیں جاتا تھا بلکہ اکثر اوقات سارا مال غنیمت خلیفہ کے قبضے میں جاتا تھا۔ تاہم فوج کو مہم کے آغاز میں کافی انعام واکرام دیا جاتا تھا۔ عباسی دور میں جزیہ نومسلموں سے وصول نہیں کیا جاتا تھا۔

عہد بنو عباس میں شاہی خزانے کا سب سے بڑا مصرف دفاع تھا لیکن علم وفن کی سرپرستی پر بھی کچھ کم خرچ نہیں ہوتا تھا۔ بیت المال

بنوامیّہ کی طرح خلیفہ کی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا تھا اور وہ اس میں سے حسب خواہش خرچ کرسکتا تھا۔ تہذیب وثقافت کے علمبردار کی حیثیت سے عباسی خلفانے شاہی خزانہ سے عظیم عمارات، خوبصورت باغات اور جنت نما شہر تعمیر کیے جو ہلاکو خاں کے ہاتھوں تباہی کے بعد بھی ان کی عظمت کے گیت گاتے رہے۔

عہدِ عباسی میں عوام کی معاشرتی اور اخلاقی حالت

عہدِ عباسیہ میں مملکت اسلامیہ نے ایک بین الاقوامی صورت اختیار کر لی جس میں مختلف قوموں کے لوگ شریک تھے۔ ان کے باہمی میل جول سے ایک نیا تمدن ظہور میں آیا۔ یہ مختلف قوموں کے رسم و رواج اور طریقہ کار کا لطیف امتزاج تھا۔ بنوعباس کا دورِ خلافت فراغت اور خوشحالی کا زمانہ تھا اس لیے شہروں نے خوب ترقی کی۔ شہروں کی رونق روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ان کو خوبصورت محلوں، مسجدوں اور دیگر عمارتوں سے سجایا گیا تھا۔ بازار بارونق تھے۔

عباسی حکومت کا دارالخلافہ بغداد اس وقت دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ مسلمانوں کے علم وفن، تہذیب و شائستگی اور شان وشوکت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس شہر کی بنیاد منصور نے رکھی تھی۔ اس کو ایک دائرہ کی شکل میں بسایا گیا تھا۔

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ یہ لوگ ذمّی کہلاتے تھے۔ اس میں عموماً زرعی طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ ان کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ شہروں میں تمام اہلِ کتاب عیسائی، یہودی اور صابی ذمی تھے، بعد میں کچھ اور طبقے ذمیوں میں شامل کر دیے گئے۔ دیہاتی علاقوں میں یہ لوگ اپنی پرانی تہذیب پر قائم رہے اور اپنی مقامی زبان کو برقرار رکھا۔ ذمیوں کے حقوق کی پوری نگہداشت ہوتی تھی۔

اس دور میں عورتوں کو بڑی آزادی حاصل تھی۔ مہدی کی بیوی خیزران، ہارون کی بیوی زبیدہ، مامون کی بیگم پوران، مہدی کی بیٹی علیہ بڑی ممتاز خواتین تھیں۔ جن کو ملکی معاملات میں دخل حاصل تھا اور اپنی قابلیت اور ذہانت کے باعث بہت مقبول اور مشہور تھیں۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت پر بڑی توجہ دی جاتی تھی۔ شوہر کی خدمت، بچوں کی نگہداشت اور امورِ خانہ داری ان کے بڑے فرائض خیال کیے جاتے تھے۔

اس عہد میں زراعت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ خاص طور پر عراق زراعت کا بڑا مرکز تھا۔ چونکہ یہ شعبہ براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت تھا اس لیے اس کی ترقی پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ دجلہ اور فرات سے بہت سی نہریں نکالی گئی تھیں۔ مہدی نے واسط کے علاقے میں ایک نہر کھدوائی تھی۔ خلیفہ منصور کے عہد میں ایک نہر انبار بغداد لائی گئی تھی۔ دریائے دجلہ کے مشرقی علاقے میں بھی زراعت کو فروغ دینے کے لیے نہروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ دلدلی علاقوں کو خشک کر کے قابل کاشت بنانے کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ بعض علاقے تو بالکل باغات اور سبزہ زاروں میں تبدیل کر دیے گئے تھے۔ کسانوں کو جو لگان دینا پڑتا تھا وہ معمولی تھا۔ اس کے باعث زراعت کی حالت بڑی اچھی تھی۔

اس دور میں صنعت وحرفت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ کان کنی کے پیشہ نے خوب ترقی کی۔ خراسان سے لوہا، کرمان سے چاندی

اور شیشہ، تبریز سے سنگ مرمر اور شمالی ایران سے نمک اور سنگ مرمر حاصل کیا جاتا تھا۔ اس طرح معدنیات زمین سے حاصل کر کے صنعت و حرفت میں استعمال ہوتی تھیں۔ بصرہ میں شیشہ سازی اور صابن سازی کے کارخانے قائم ہوئے۔ ملک میں کئی جگہ کاغذ کے کارخانے بھی قائم تھے۔ عربوں نے کاغذ بنانا چینیوں سے سیکھا اور یورپ کو سکھایا۔ ایران، شام اور عراق میں اعلیٰ قسم کا ریشمی اور اونی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ خوزستان سوتی کپڑے کے لیے مشہور تھا۔ فرغانہ میں لوہے کے برتن بنتے تھے غرضیکہ ہر قسم کی صنعت و حرفت ترقی عروج پر تھی۔

بنوعباس ؓ کے عہد میں تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مسلمان بڑے اچھے جہاز ران تھے اور وہ اپنے جہازوں میں دور دراز ملکوں میں پہنچے۔ تجارت اور حصولِ علم کے لیے لوگوں نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا۔ اپنی تہذیب پھیلائی اور نوآبادیات قائم کیں۔ مسلمان مالابار، لنکا، انڈونیشا، ملایا، ہند اور چین تک جا پہنچے۔ سمندر کے علاوہ خشکی کے راستے بھی بڑے بڑے قافلے غیر ملکوں کو جاتے تھے۔ عرب افریقہ کے اندرونی حصوں میں دور دور تک گئے۔ بغداد اور بصرہ تجارت کے دو بڑے مراکز تھے۔ یورپ کے ملکوں سے تجارت ہوتی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں سے گندم، چاول، شکر پھل، دھات، کی چیزیں، شیشہ کی مصنوعات، اونی اور ریشمی کپڑے، تیل، عطر اور صابن وغیرہ دوسرے ملکوں کو جاتے تھے اور باہر سے مصالحہ، جڑی بوٹیاں، صندل، جواہرات، بانس، آبنوس، ہاتھی دانت اور قیمتی پتھر وغیرہ منگوائے جاتے تھے۔

عہدِ عباسیہ میں علم وادب اور فنونِ لطیفہ

عہد بنوعباس میں علوم وفنون کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اکثر عباسی خلفا غیر معمولی عقل و دانش کے مالک تھے۔ وہ علوم وفنون کی اہمیت خوب جانتے تھے اور اہل علم وفن کی قدر کرتے تھے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ مسلمان عالموں نے دُور دراز ملکوں کا سفر کر کے علم و حکمت کے جوہر کو تاریکی سے نکال کر ساری دنیا میں روشناس کروایا۔ ان ترجموں سے ساری دنیا نے فائدہ اٹھایا۔ مسلمانوں نے محض کتابوں کے ترجموں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان سے فائدہ حاصل کر کے جدید معلومات اور تحقیقات شروع کیں۔ طب، فلسفہ، سائنس وغیرہ میں گہری تحقیق کی اور ایسی کتابیں تحریر کیں جو آج علمی دنیا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلمانوں نے علم و حکمت کی ہر شاخ میں بڑے بڑے اضافے کیے۔ انھوں نے حدیث، فقہ، علم الکلام، شعر وسخن، جغرافیہ، کیمیا، ہیئت، لغت، ریاضی اور موسیقی وغیرہ پر مستند کتابیں لکھیں۔ نئی ایجادیں بھی کیں۔ اکثر علوم کے اصول اور قاعدے معلوم کیے اور علم وفن کو بہت بلند مقام پر پہنچایا۔

اس زمانے میں مسلمانوں نے طب اور جراحت میں بڑا کمال حاصل کیا۔ عباسی خلفا نے اس علم کی خاص سرپرستی کی۔ دوا سازی کے سلسلے میں علم نباتات پر تحقیق کے لیے کئی شہروں میں ایسے باغات لگائے گئے جہاں ہر قسم کی نباتات اور جڑی بوٹیاں کاشت کی جاتی تھیں۔ ان پر تجربے ہوتے تھے اور وہاں تجربہ کار سائنس دان درس بھی دیتے تھے۔ کیمیائی تجربہ گاہوں کے علاوہ خیراتی ہسپتال بھی تھے اور دور دراز کے باشندوں کے لیے سفری شفاخانے بھی تھے۔ اس زمانہ کا سب سے بڑا معالج ذکریا الرازی تھا جو ایک باکمال جراح تھا۔ اس نے زخموں کو سینے اور باندھنے کا طریقہ رائج کیا۔ چیچک پر ایک رسالہ تحریر کیا۔ اس کی طب کی کتاب ''الحاری'' اور کیمیا کی کتاب ''کتاب الاسرار'' کا یورپ کی تمام زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس زمانے میں نامور طبیب بوعلی سینا بھی موجود تھا۔ اس نے طب کے علاوہ فلسفہ، ہیت اور علم اللسان وغیرہ پر بھی کتابیں لکھیں۔ اس کی کتابوں میں ''کتاب الشفا'' اور ''قانونِ طب'' سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

یہ عرصہ تک یورپ وایشیا کے کالجوں میں نصاب کا کام دیتی رہی۔ جاحظ نے علم الحیوانات پر ایک کتاب ''کتاب الحیوان'' لکھی۔ کیمیا کو ترقی دینے میں مسلمانوں کا بڑا حصہ ہے۔ جابر بن حیان اس علم کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے شورے اور گندھک کا تیزاب معلوم کیا۔ ابوموسیٰ جعفر بھی بڑا کیمیا دان تھا۔ جابر اور موسیٰ کیمیا کے موجد قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے کیمیا سے متعلق بہت سی نئی کتابیں تحریر کیں۔ الرازی بھی علم کیمیا کا مشہور عالم تھا۔ عربوں نے علم ریاضی میں نئی نئی باتیں شامل کیں جس سے اس علم کی شکل ہی بدل گئی۔ محمد بن موسیٰ خوارزمی ریاضی، ہندسہ اور الجبرا میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس کی تحقیقات سے علم الحساب کو بہت ترقی ہوئی۔ عمر خیام اور ابن الہیثم اور الکندی بڑے اچھے ریاضی دان تھے۔ عباسی خلفا کی سر پرستی میں علم ہیئت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ عربوں نے یونانیوں اور ہندوؤں کی معلومات میں وسیع اضافے کیے اور ان کی غلطیوں کو درست کیا۔ مامون نے علم ہیئت کو خاص طور پر ترقی دی اور شماسیہ میں رصد گاہ قائم کی۔ جہاں دھوپ کی گھڑی، دور بین اصطرلاب اور دیگر آلات کی مدد سے زمین کا قطر ناپا گیا۔

علم تاریخ سے مسلمانوں کو ہمیشہ گہری دلچسپی رہی ہے۔ اس عہد میں بڑے بڑے نامور مورخ پیدا ہوئے۔ ان میں سے ابن خورذابہ، ابن سعد، ابن اسحاق، ابن قتیبہ، بلاذری، طبری، مسعودی، ابن اثیر، ابن ہشام ہمدانی اور البیرونی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں مسلمانوں نے تجارت اور تلاش علم میں دور دراز ممالک کے بحری اور بری سفر اختیار کیے۔ اس سے لوگوں میں دُور دراز کے ملکوں کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا، جغرافیہ کے اصول اور قاعدے مرتب ہوئے۔ مامون نے بہت سے عالموں کی مدد سے زمین کا نقشہ تیار کرایا۔

عربوں کے اس دور میں بڑے بلند پایہ فلسفی پیدا ہوئے، جنھوں نے یونانی فلسفیوں سقراط، بقراط، ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کے ترجمے کیے اور ان کی تشریحات لکھیں۔ جن لوگوں نے یونانی فلسفہ پر عبور حاصل کیا ان میں الکندی، فارابی، بوعلی سینا بہت مشہور ہیں۔ الکندی علم کائنات کا بہت بڑا عالم تھا اور فلسفہ پر دسترس کے باعث ''حکیم عرب'' کہلاتا تھا۔ فارابی جو ''ستار المدینہ'' کا مصنف تھا اپنے زمانے کا سب سے بڑا مفکر تھا۔ فلسفہ سے دلچسپی کے باعث مذہبی خیالات میں بڑی تبدیلی آنے لگی۔ مختلف فلسفہ دانوں نے مذہبی عقائد کو فلسفیانہ اصولوں پر جانچنا شروع کر دیا۔ اس طرح معتزلہ، مرجیہ وغیرہ فرقے پیدا ہوئے اور علم الکلام پر بہت زور دیا جانے لگا۔

عہد عباسیہ میں احادیث کے بہت سے مجموعے تیار ہوئے۔ چھ مستند مجموعے بخاری، مسلم، ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور داؤد اس دَور میں مرتب کیے گئے۔ اسلامی فقہ نے بہت ترقی کی۔ اہلسنت کی فقہ کے چاروں امام، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام حنبلؒ اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ اس عہد میں بہت سے نئے فرقے پیدا ہوئے۔ معتزلہ فرقہ نے اس عہد میں بہت ترقی کی کیونکہ اس کو مامون اور معتصم کی سر پرستی حاصل رہی۔ معتزلہ کا زور توڑنے کے لیے امام ابوالحسن اشعری نے علم الکلام کی بنیاد رکھی۔ اس زمانہ میں سب سے بڑے عالم دین امام غزالیؒ تھے جن کی کتاب ''احیائے علوم'' بہت مشہور ہے۔

سائنس کے ساتھ ساتھ اس دور میں ادب، لسانیات اور شاعری کو بھی ترویج ہوئی۔ عربی زبان اپنے پورے عروج پر پہنچی۔ صرف ونحو پر کتابیں تحریر کی گئیں۔ اس دور میں عربی صرف عربوں کی زبان نہ تھی بلکہ ایک عالمگیر زبان بن چکی تھی۔ فارسی شاعری نے بھی اس زمانے میں بہت ترقی کی۔ رودکی، فردوسی، سنائی، انوری، عطار، فرخی، عنصری، رومی، عمر خیام اور سعدی جیسے باکمال شاعر پیدا ہوئے۔

بنوعباس کے عہد میں تعلیم وتدریس کا سلسلہ بڑے وسیع پیمانے پر جاری تھا۔ جگہ جگہ مدرسے اور کالج قائم تھے اور ہر علم کے استاد موجود تھے۔ کتابیں لکھنے اور پڑھنے کا شوق بہت زیادہ تھا اور چھاپہ خانوں سے کتابیں چھپ کر ارزاں قیمت پر فروخت ہوتی تھیں۔ لوگوں کو علمی مباحثوں کا بہت شوق تھا۔ ہر تعلیم یافتہ آدمی اپنی قابلیت کو بڑھانے کے لیے علمی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ اس قسم کی مجلسیں عام تھیں اور ان میں ہر قسم کے علوم وفنون پر بحث کی جاتی تھی۔ بعض مجالس مثلاً ''اخوان الصفا'' ان بحثوں کو کتابی شکل میں شائع بھی کرتی تھی۔

بچے کو شروع میں ہی مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ چھ سال کی عمر میں مسجد سے ملحقہ مکتب میں بھیج دیا جاتا تھا۔ جہاں قرآن، حدیث، حساب، ادب اور صرف ونحو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کی سب سے پہلی درسگاہ مامون نے بغداد میں قائم کی جو ''بیت الحکمت'' کے نام سے موسوم تھی۔ اس میں کتب خانہ اور دارالترجمہ بھی تھا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں نظام الملک نے ''مدرسہ نظامیہ'' قائم کیا جو اس دور کی سب سے پہلی یونیورسٹی تھی۔ اس کے بعد ''مدرسہ مستنصریہ'' قائم ہوا۔ مدرسہ نظامیہ کی شاخیں نیشاپور اور ہرات میں بھی تھیں۔ دمشق، موصل، بیت المقدس وغیرہ شہروں میں بڑی بڑی درسگاہیں تھیں۔ بغداد میں دارالعلوموں کے علاوہ بڑے بڑے کتب خانے بھی تھے۔ دوسرے شہروں میں بھی اس طرح کے کتب خانے موجود تھے۔

فنِ تعمیر

مسلمانوں نے شاعری کے طرح آرٹ میں بھی خصوصی ترقی کی۔ وہ جزئیات اور تفصیلات کو خوب جانتے تھے۔ عباسی خلفا نے فنِ تعمیر، مصوری، خطاطی، موسیقی اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی اور یہ تمام فنون اس دور میں اپنے اوجِ کمال تک پہنچ گئے۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعمیرات میں ہندی، ایرانی اور شامی اثرات تھے مگر انھوں نے صرف نقل کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس فن میں بڑی اختراعات کیں۔ ان کی عمارتوں میں ستونوں کی خوشنمائی چھتوں کے نقش ونگار، نازک استرکاری، گنبدوں اور میناروں کی شان، محرابوں کی خوبصورتی، جالیوں کی میناکاری آج بھی فنِ تعمیر کے نادر نمونے شمار کیے جاتے ہیں۔ اکثر محلوں میں اس ترکیب سے رنگارنگ شیشے لگائے جاتے تھے کہ تمام محل بقعۂ نور بن جاتا تھا۔

اس زمانے میں مسلمان کاریگر تانبے، مٹی اور پیتل کے برتنوں پر حیرت انگیز طریقے سے بیل بوٹے بناتے تھے۔ چراغوں، صراحیوں، گلدانوں اور پیالوں وغیرہ کو رنگ برنگ کے نقش و نگار سے سجایا جاتا تھا۔ ریشمی رومالوں کو خوبصورت تصاویر اور نقش ونگار سے خوشنما بنایا جاتا تھا۔ شیشے پر ملمع کاری اور نقش طرازی بڑی خوبصورتی سے کی جاتی تھی۔ خوش نویسی کا فن عربوں میں عرصہ دراز سے رائج تھا۔ بنوامیہ کے عہد میں خطِ نسخ کا رواج ہوا اور اس کو بنوعباس کے عہد میں مزید ترقی ہوئی۔ اس کے بعد خطِ نستعلیق کا رواج ہوا اور اس کو بنوعباس کے عہد میں مزید ترقی ہوئی۔ خوشنویسوں کی بڑی قدر ومنزلت کی جاتی تھی۔ مامون کے عہد میں ریحان اس فن میں مہارت رکھتا تھا۔ فنِ خطاطی کو اس لیے وقار حاصل ہوا کیونکہ اس کا مقصد قرآن شریف کو تحریر کے ذریعے زندہ جاوید بنانا تھا۔ یہ خالص اسلامی فن تھا اور مصوّری بھی اس سے متاثر ہوئی مسلمان جو جاندار تصاویر نہیں کھینچ سکتے تھے خطاطی ان کے ذوق کے اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ چونکہ مسلمانوں کو کتابوں کے سجانے کا بہت شوق تھا اس لیے خطاطی نے بہت ترقی کی۔

فنِ موسیقی

اس دور میں موسیقی نے بھی خوب فروغ حاصل کیا۔ علمائے اسلام موسیقی کے خلاف تھے مگر اس کے باوجود بغداد اور دمشق دونوں جگہ موسیقی نے ترقی کی۔ الکندی، الرازی، فارابی اور بوعلی سینا نے موسیقی پر کتابیں لکھیں۔ مہدی پہلا عباسی خلیفہ تھا جس کو موسیقی سے شغف تھا۔ اس نے مکہ کے مشہور مغنی سیاط کو اپنے دربار میں بلایا۔ ابراہیم موصلی جو اس دور کا سب سے مایہ ناز موسیقار گزرا ہے، سیاط کا شاگرد تھا۔ ہارون اور اس کے درباری موسیقی کی خوب سرپرستی کرتے تھے۔ بغداد اس وقت موسیقی کے ماہرین کا مرکز بن گیا تھا۔

بنوعباس کے زوال کے اسباب

i- بنوعباس کے خلاف تحریکوں کا آغاز

عباسی حکومت حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے انتقام کے نعرے پر قائم کی گئی تھی۔ بنوامیہ کے مقابلے میں بنوہاشم کے استحقاق خلافت کا پروپیگنڈا کیا گیا تھا اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے قرابت داری اس کی بنیاد قرار دی گئی تھی، لیکن ہاشمی تحریک کی کامیابی کے نتیجہ کے طور پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے چچا عباسؓ کی اولاد نے خلافت پر قبضہ کرلیا۔ حضرت علیؓ کی اولاد قرابت رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وجہ سے خلافت پر اپنا حق سمجھتی تھی۔ خود ہاشمی داعیوں میں سے اکثر اہل بیت کی محبت ہی کی وجہ سے امویوں کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے کوشاں تھے لیکن عباسیوں نے حکومت پر قبضہ کرکے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا، اس لیے علوی شہزادوں اور داعیانِ اہلِ بیت نے بار بار علوی خلافت قائم کرنے کی کوشش کی۔ عباسیوں نے ایسی تمام بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا۔ نفسِ ذکیہ، ان کے بھائی ابراہیم، ان کے بعد حسین بن علی، یحییٰ بن عبداللہ اور امام علی کی بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا گیا اور عباسی دربار میں حضرت علیؓ پر کھلم کھلا تنقید ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبانِ اہلِ بیت کا ایک گروہ عباسیوں کے خلاف ہوا اور اس نے ان کے خلاف ہر تحریک کا ساتھ دیا۔

ii- شخصی حکومت

عباسی حکومت بھی اموی حکومت کی طرح شخصی حکومت تھی جو عوام کے نظریات اور رجحانات کے خلاف تھی۔ علما اور سمجھدار عوام خلافت راشدہ کا نظام چاہتے تھے، اس لیے عوام کا ایک گروہ ہمیشہ ان کے خلاف رہا۔ عباسی حکومت خراسانیوں کے بل بوتے پر قائم ہوئی تھی۔ اس لیے عباسی خلفا انھیں پر اعتماد کرتے تھے، انھیں چاہیے تھا کہ عربوں کو بھی اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے لیکن انھوں نے ہمیشہ عجمیوں ہی پر بھروسہ کیا، چنانچہ ہر بغاوت کے لیے حجاز وعراق وعرب کا علاقہ نہایت موزوں سرزمین ثابت ہوتا تھا۔

iii- عربی وعجمی آویزش

ایرانی جو کہ عباسی حکومت کے اصل بانی تھے زیادہ دیر تک اس حکومت کے ساتھ نہ چل سکے۔ ابومسلم خراسانی کے قتل کے بعد ہر باغی کے لیے خراسان کی سرزمین موزوں ثابت ہوتی رہی۔ رہی سہی کسر برامکہ کے زوال نے پوری کردی، چنانچہ شیعانِ علیؓ کو سرزمین ایران میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور معتصم کی ترک فوج کے قیام کے بعد تو ایرانی عناصر نے عباسی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی

جدوجہد عملاً شروع کردی، دولت طاہریہ کے قیام کے ساتھ ہی ایران میں متعدد خودمختار حکومتیں قائم ہونے لگیں اوران میں سے بعض نے تو بغداد پر قبضہ کر کے عملاً خلیفہ کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

iv- نااہل حکمران

معتصم کے بعد کے خلفا انتہائی کمزور واقع ہوئے تھے۔ متوکل نے کچھ وقار بحال رکھا لیکن اس کا اپنا قتل خلافت عباسیہ کے وقار کو خاک میں ملانے کا باعث بنا اس کے بعد کے خلفا اتنے کمزور تھے کہ انھوں نے اپنے آپ کو کلی طور پر فوج کے حوالے کر دیا۔ نتیجتاً فوج نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ اگر خلیفہ نے اس سے آزاد ہونے کی کوشش بھی کی تو وہ ناکام بنادی گئی۔ بعد کے خلفا تو وزرا کی بجائے نائب السلطنت مقرر کرنے لگے اور گویا عملاً انھوں نے امور سلطنت کو مکمل طور پر دوسرے لوگوں کے حوالے کر دیا اور خود لہو ولعب میں مشغول رہنے لگے۔ چنانچہ خودمختار حکمرانوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا اور خلیفہ کو بالکل کٹھ پتلی بنالیا اور خلیفہ محض ان کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا۔

v- عیش پسندی

عہد عباسی میں دولت کی فراوانی کی وجہ سے لوگ عیش وعشرت کا شکار ہو گئے تھے بالخصوص اہلیانِ بغداد کی حالت اس سلسلے میں نہایت پتلی تھی۔ جو قوم عیش وعشرت میں مشغول ہو جاتی ہے اس کی فوج کمزوری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کمزوری بھی خلافت عباسیہ کے زوال کا ایک سبب بنی۔ عباسی دور کے آخر میں مسلمانوں کا دورِ جمود شروع ہو چکا تھا۔ انھوں نے تعمیری کام کرنے کی بجائے آپس میں لڑنا شروع کر دیا تھا۔

vi- باہمی اتحاد کا فقدان

مذہبی جھگڑوں نے امت مسلمہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور کسی دشمن کے مقابلے میں متحد ہو کر لڑنا تو درکنار انھیں امور سلطنت کی طرف توجہ دینے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس انحطاط کا لازمی نتیجہ تباہی تھا جو ظاہر ہو کر رہا۔

vii- منگول

منگول ایک ابھرتی ہوئی قوت تھے۔ وہ ابھی تہذیب کی برائیوں کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ ان کے عزائم بلند تھے۔ ان کی وحشت و بربریت ان کے دشمنوں کو مرعوب کر دیتی تھی۔ ان کے عظیم عساکر اکثر و بیشتر فتح یاب ہوتے تھے، اس لیے جب انھوں نے خلافتِ عباسیہ کے خاتمہ کا ارادہ کیا تو اس کی راہیں خود بخود کھلتی چلی گئیں۔ رہی سہی کسر ابن علقمی وزیر کی غداری نے پوری کردی۔ خلیفہ مستعصم نے تمام اختیارات اس کی طرف منتقل کر رکھے تھے۔ اس نے ایک طرف خلیفہ کو صحیح حالات سے ہمیشہ بے خبر رکھا اور خلیفہ سے کہہ سن کر عباسی فوجیں برخاست کروادیں دوسری طرف ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کی دعوت اور اسے پوری امداد کا یقین دلایا۔ جب امور سلطنت کا مختار کل ہی سلطنت کو تباہ کرنے پر تل جائے تو بچاؤ کی کوئی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ 1258ء میں ہلاکو خاں نے حملہ کر کے ہارون و مامون کی عظمت کی یادگار اور خاندان عباس کے ٹمٹماتے چراغ کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

مشقی سوالات

1۔ درج ذیل سوالات کے تفصیلی جواب تحریر کریں۔

i- بنوعباس کے فوجی نظام پر ایک جامع نوٹ لکھیں۔

ii- بنوعباس کے زوال کے اسباب تحریر کریں۔

iii- عہد بنوعباس میں علم وادب اور فنونِ لطیفہ کی ترقی کے بارے میں تحریر کریں۔

2- مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں۔

i- صاحب الشرطہ کے کیا فرائض تھے؟

ii- عباسی دور میں حکومت کے ذرائع آمدن کے نام لکھیں؟

iii- ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کی دعوت کس نے دی؟

iv- عہدِ عباسی کی ممتاز خواتین میں سے تین کے نام لکھیں۔

v- عہدِ عباسی میں مسلمان تجارت کے لیے کن کن دور دراز ممالک تک جا پہنچے؟

vi- زخموں کو سینے اور باندھنے کا طریقہ کس نے رائج کیا؟

vii- عہدِ عباسی کے کوئی سے دو ماہرینِ علم کے نام اور ان کی ایک ایک کتاب کا نام بھی لکھیں۔

viii- عہدِ عباس کے مسلمان جغرافیہ دانوں میں سے تین کے نام لکھیں۔

ix- عہدِ عباسی میں مرتب کیے گئے احادیث کے دو مجموعوں کے نام لکھیں۔

x- عباسی خلفا نے کس فن کی سرپرستی کی؟

3- خالی جگہ پُر کریں۔

i- عہدِ عباسیہ میں دار الخلافہ کی پولیس کا افسر.......................... کہلاتا تھا۔

ii- عباسی دور میں انتظامی سہولت کے لیے ملک کو.......................... میں منقسم کیا گیا تھا۔

iii- عہدِ عباسیہ میں.......................... کا شعبہ سرکاری املاک کی نگہداشت کرتا تھا۔

iv- عہدِ عباسیہ میں احادیث.......................... کے مجموعے مرتب کیے گیے۔

iv- مامون الرشید نے بغداد میں اعلیٰ تعلیم کی پہلی درسگاہ بنائی جس کا نام.......................... تھا۔

4- غلط اور صحیح کی نشاندہی کریں۔

i- بنوعباس کے عہد میں تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

ii- عہدِ بنوعباس میں شاہی خزانے کا سب سے بڑا مصرف تعلیم تھی۔

iii- عہدِ عباسیہ میں مملکت اسلامیہ نے ایک بین الاقوامی صورت اختیار کر لی تھی۔

iv- عباسی حکومت کی ایک بہت بڑی خاصیت عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی تھی۔

v- عباسی فوج کے تین حصے تھے۔